

نگہت عبد اللہ
گھر کی کھڑکی سے

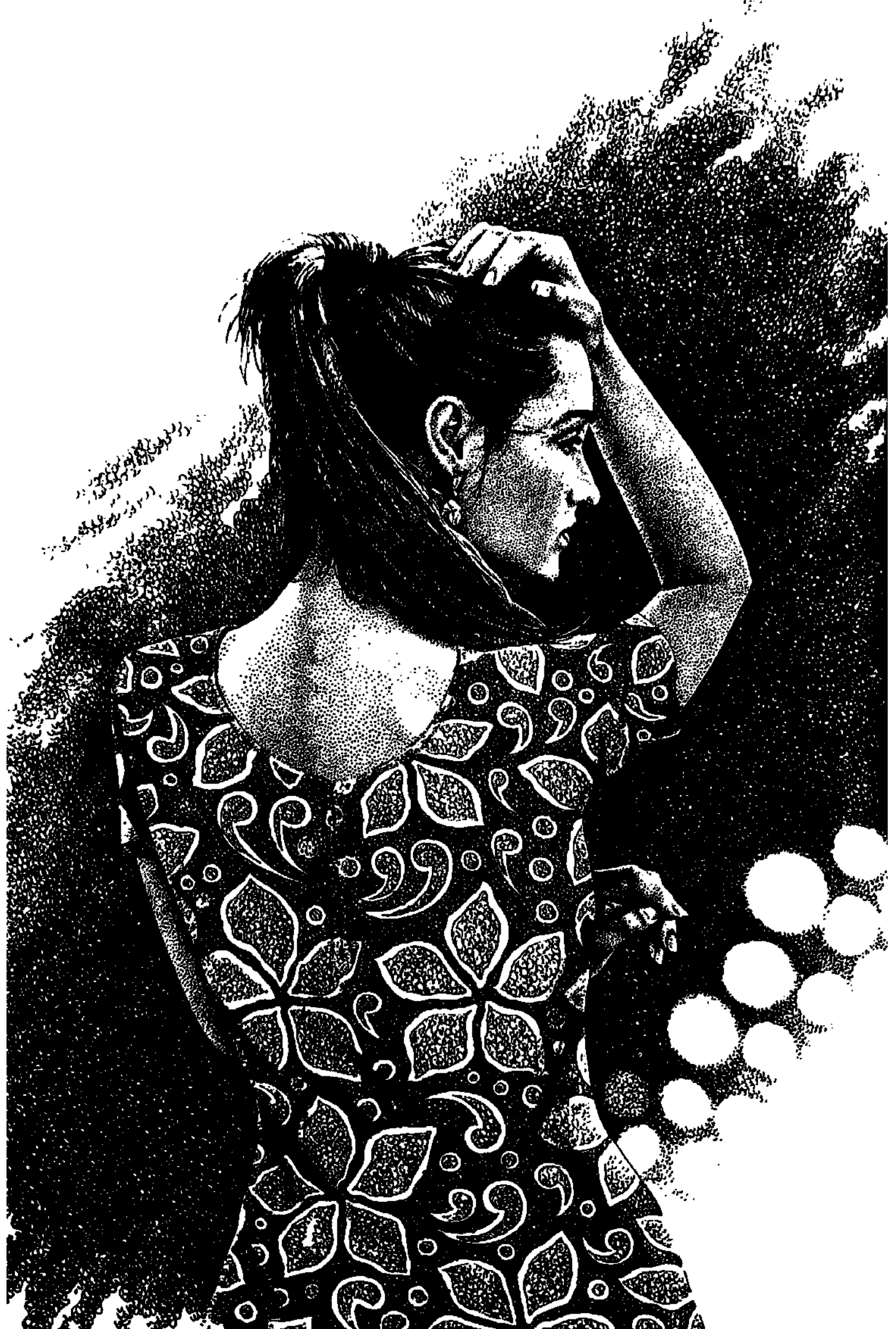
محمّد ناول

Digest
Novels
Lovers
group

اُس نے کھڑکی کھولی اور سامنے چھوٹا
سا باغیچہ دیکھ کر ایک پل کو اُس

digest library.com





کی آنکھیں چمکیں، ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ لہرائی
پھر فوراً پلٹ کر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اُس
کے لیے ٹھیک تھا۔ ایک طرف دیوار میں الماری اور
دوسری طرف ایک نصب تھا اُس نے کھڑے کھڑے
سٹینک سوچ ڈال، یعنی ادھر بلیک ادھر دو کرسیاں
ایک میز اور اس طرف دیوار کے ساتھ وہ اپنا کتا بول
والا ایک رکھے گا۔ گویا یہ کمرہ اُس نے اپنے لیے
منتخب کر لیا۔ تبھی اماں پکارتی ہوئی آگئیں۔
”شاہجہان! تم یہاں کھڑے ہو، سامان نہیں
اٹھاؤ گے کیا؟“

”جی اماں! آ رہا ہوں“ وہ کہتا ہوا الماری کی
طرف بڑھا۔ اور اُسے کھول کر دیکھنے کے بعد اماں سے
کہنے لگا۔ ”اماں! میرے لیے یہ کمرہ ٹھیک ہے۔“
”میں اور اماں بڑے کمرے میں، اور کنارے
والے کمرے کو ڈرائنگ روم بنا دیتے ہیں؟“ رونی
اندر آتے ہوئے بولی تو اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا
پھر اماں سے کہنے لگا۔

”اماں! آپ بیٹھیں آرام سے، میں اور رونی
سامان سیٹ کر دیتے ہیں، چل رونی!“ وہ بہن کے
کنڈھ پر ہاتھ مارتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔
پھر شام ڈھلنے سے پہلے ہی اُس نے رونی کے
ساتھ بل کر بیٹوں کمروں میں سامان سیٹ کر دیا۔ گوکہ
بہت تھکا دینے والا کام تھا اور دونوں تھک بھی گئے
نہتے۔ لیکن یہ تھا کہ اب رات میں اطمینان سے سو
سکتے تھے، بہر حال اس سارے کام سے فارغ ہو کر
وہ نہانے چلا گیا۔ واپس آیا تو چھوٹے سے برآمدے میں
اماں چائے لیے بیٹھی تھیں۔

”صرف چائے۔ اماں اتنی بھوک لگ رہی ہے۔
آب خالی چائے پلا رہی ہیں؟“ وہ تولیہ ایک طرف ڈال
کر اماں کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بھی رونی موسوں سے
بھری پلیٹ لیے آگئی۔ تو وہ اُسے دیکھ کر بوجھنے لگا۔
”یہ کہاں سے آئے؟“

”اوپر سے!“ رونی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”اوپر سے بھائی!“ اب کے رونی نے اوپر مکان

مالک کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی ہنسا۔
”ارے واہ، مالک مکان ایسے بھی ہوتے ہیں!“
”اچھا چلو، باتیں بعد میں بنانا، چائے ٹھنڈی ہو
رہی ہے،“ اماں نے دونوں کو بلو کا، پھر قدرے توقف
سے کہنے لگیں۔ ”اچھا گھر مل گیا ہے، ہووا دار بھی ہے، اب
رات میں بیٹھ کر اپنے آبا کو خط لکھ دو، پتا بھی لکھ دینا؟“
”رونی لکھ دے گی!“ اُس نے بڑے آرام سے یہ
کام رونی کے سر ڈال دیا۔ تب ہی داغیچے کی طرف سے نکل
کر ایک لڑکی خلاصے لاپرواہ سے انداز میں ادھر ادھر
دیکھتی ہوئی ان کے پاس برآمدے میں آئی اور کچھ
تعجب سے بولی۔

”اتنی جلدی سارا سامان سیٹ کر لیا۔ میں تو بھی
تھی تین چار دن لگیں گے۔“

”ارے نہیں، کوئی اتنا زیادہ سامان تو نہیں تھا۔“
رونی اپنے برابر اُس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا تے ہوئے
بولی۔ ”جیکہ وہ یونہی بلا ارادہ اُس کی طرف متوجہ ہو گیا
تھا۔ اور وہ بیٹھی تو پھر کسی کے کہے بنا پلیٹ میں سے
ایک سموسہ اٹھا کر کھانے لگی، جس پر اُس نے درازی
بھنویں اچکا کر گویا اُس کی بے تکلفی پر تعجب کا اظہار
کیا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا اماں! کھانے کا بتا دیں، کیا لانا ہے؟“
”میں اس وقت کچھ نہیں پکاؤں گی، بہت تھک
گئی ہوں!“ رونی نے منع کیا اور وہ لول پڑی۔
”میں پکا دوں گی؟“ وہ ذرا سا ٹھٹھا پھر فوراً سنبھل
کر بولا۔

”جی نہیں شکریہ!“

”شکریہ کس بات کا؟“ وہ بنا کسی لحاظ کے
براہ راست اُس سے مخاطب ہو گئی۔ ”جب کھانا پکا
دوں گی، اس کے بعد شکریہ کہیے گا اور اگر نہیں بھی
کہیں گے تو میں برا نہیں مانوں گی، کیونکہ مجھے سرے
سے برا ماننا آتا ہی نہیں۔ پتا نہیں لوگ کیسے ذرا
ذرا سی بات کا برا مان جاتے ہیں!“

”مانی گاڈ!“ وہ اُس کے لوٹے چلے جانے پر ٹپٹا

گیا۔ اور جیسے ہی وہ خاموش ہوئی پوچھنے لگا۔

”آپ کی تعریف؟“

”مجھے پیار سے بلی کہتے ہیں“ وہ اتنے آرام سے بولی کہ روٹی بے ساختہ ہنسی اور وہ اماں کی موجودگی کے باعث مزید سٹپٹایا پھر وہاں سے کھسکتے ہی میں عافیت نظر آئی تھی۔

پھر رات میں غالباً تھکن کے باعث اماں اور روٹی کھانا کھاتے ہی سو گئیں۔ وہ بھی سونا چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ تھا کہ نئی جگہ پر نیند مشکل سے آتی تھی۔ گوکہ اب وہیں رہتا تھا۔ پھر بھی فی الحال تو جگہ نئی ہی تھی۔ اور اپنی عادت سے واقفیت کی بنا پر وہ کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔ اُس کے خیال میں کروٹیں بدلنے سے بہتر تھا کہ وہ اسٹڈی کر لے۔ لیکن کچھ تھکن کے باعث بڑھنے کی طرف اُس کا ذہن مائل نہیں ہوا تو وہ آبا کو خط لکھتے بیٹھ گیا۔

آبا کویت میں تھے اور ابھی دو ماہ پہلے ہی غم روزگار کے سلسلے میں گئے تھے، اس سے پہلے وہ یہیں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر رہے تھے۔ گوکہ کنبہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن کمزور ذہن گانی کے علاوہ روٹی اور اس کے تعلیمی اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے، روٹی انٹرمیڈ اور وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ اور زیادہ وقت تو گزر چکا تھا۔ اب کم وقت تھا کہ وہ آبا کا سہارا بن جاتا۔ لیکن اُس سے پہلے ہی دوسرے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ شروع ہی سے تایا جی کے گھر مقیم تھے۔ اچھا بڑا گھر تھا اور تایا جی کی فیملی بھی کوئی اتنی بڑی نہیں تھی۔

ایک طویل عرصہ سب نے ساتھ مل جل کر گزارا۔ بس جب سے آبا تایا جی کی بہو بنیں تب سے جلنے کیسے خونی اور نہ ٹوٹنے والے رشتے نہیں بس منظر میں چلے گئے۔ اور نئے رشتوں کا تقاضا یہ تھا کہ بیٹی کا گھر آباد رکھنے کے لیے آبا اپنے لیے اور گھر کا انتظام کرتے جبکہ آمدنی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ کہیں پارٹ ٹائم جاب کر لے پھر یوشن بھی بڑھا سکتا تھا۔ لیکن اُبانے اُسے اجازت نہیں دی۔ کیونکہ اُس کی اپنی بڑھان اتنی لُف تھی اور آبا چاہتے تھے وہ کیسوی سے بڑھے۔ یوں تھوڑی کوشش کے بعد وہ خود ہی کویت چلے گئے۔ اور ابھی پندرہ دن

پہلے اُن کا پہلا ڈرافٹ آیا تھا۔ ساتھ ہی اُنہوں نے اماں کو تاکید سے لکھا تھا کہ وہ فوراً تایا جی کا گھر چھوڑ دیں جو کہ اُن کی بیٹی کا سسرال بھی تھا۔ اور اماں بھی اس انتظار میں تھیں۔

یوں آنا فانا یہاں شفٹ ہو گئے۔ اور ظاہر ہے آبا کو اس نئے پتے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ خط لکھنے کے دوران ہی اُسے نیند آنے لگی تھی۔ لیکن اُس نے پورا خط مکمل کیا۔ اور ڈائری میں رکھ کر کھڑا ہوا تھا کہ کہیں قریب ہی چوڑیوں کی کھنگ سنا دی۔ اُس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنا وہم جان کر ذرا سے کندھے اٹکاٹھے پھر لائٹ آف کر کے بلیک بک آیا تھا کہ دوبارہ وہی آواز تاریکی اور سناٹے میں

خاصی واضح تھی۔ وہ کسی طرح اپنا وہم سمجھ کر سر نہیں جھٹک سکا تو اُٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا آیا اور جیسے ہی پردہ سرکایا چاندنی کمرے کے اندر تک چلی آئی ساتھ میں موتیا اور رات کی رانی کی مہک نے پورا کمرہ معطر کر دیا۔ وہ کچھ دیر چاندنی میں نہاٹے منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر آکر اپنی جگہ پر لیٹا تو معطر ہوا کے جھونکوں نے پل میں اُسے سلا دیا تھا۔ صبح جب وہ روٹی کو ساتھ لے کر کالج کے لیے نکلنے لگا تو وہی کل والی لڑکی بھاگی چلی آئی۔ اور پھولی سانسوں کے ساتھ روٹی سے کہنے لگی۔

”سنو۔ مجھے بھی ساتھ لے لیا کرو“
”ہاں چلو“ روٹی نے کہا تو وہ جبر بزر ہو کر بول چھینے لگا۔

”اس سے پہلے آپ کس کے ساتھ جاتی تھیں؟“
”کسی کے ساتھ نہیں۔ اکیلی جاتی تھی۔ اب اچھا ہے ناں۔ ایک سے دو بلکہ تین ہو گئے ہیں۔“

اُس کی زبان کے سامنے بند باندھنا مشکل تھا اس لیے وہ اُسے بولتا چھوڑ کر پہلے ہی بائیں نکل آیا پھر اسٹاپ تک اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ روٹی کے ساتھ کیا کیا باتیں کرتی آرہی ہے۔ بلکہ اُس نے سوچ لیا کہ کل سے وہ ان دونوں کے ساتھ نہیں نکلے گا۔

کیونکہ اُسے راستے میں بولتی ہوئی لڑکیاں بہت بُری لگتی تھیں۔ روٹی کو گوکہ زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی

”کیا ہوا۔؟“ اماں! اس کے چیخنے سے سچے دل
گئی تھیں۔ اور وہ انتہائی غصے کے عالم میں کہنے لگا۔
”اماں! اماں! اس لڑکی سے پوچھیں، اسے
جرات کیسے ہوئی میری الماری کھولنے کی؟ اماں کے سینے
پر رکھا ہاتھ نیچے ڈھلک گیا، یوں جیسے اطمینان ہو گیا ہو،
اور وہ الماری بند کر کے اس کے ساتھ ٹیک لگاتی
ہوئی اس سے بولی۔

”یہ بات آپ مجھ سے بھی پوچھ سکتے تھے۔“
”اماں! آپ منع کر دیں اسے، یہ میرے کمرے
میں نہ آیا کرے، ورنہ میں اس کی ٹانگیں تو کڑو دوں گا۔“
”شاہجہان!“ اماں نے تنبیہی لہجے میں ٹوکا۔
”ہوش میں رہ کر بات کرو۔ چلو بیٹی! تم میرے کمرے
میں چلو۔“

”تو یہ تو بہرہ اتنا غصہ؟“ وہ جاتے جاتے اس کا
منہ چڑھائی گئی تو وہ ہتھیلی پر زور سے مکا مار کر بولا۔
”میں اس کا خون کر دوں گا۔“

”جانے دیں بھائی! غصہ متھوک دیں۔“
”نہیں آخر یہ کس حساب میں ہمارے گھر میں
دندان پھرتی ہے۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے
اسے۔ اور یہ تم کیوں اسے اتنی لفٹ کراتی ہو؟“ آخر
میں اس کا غصہ روٹی کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو وہ منہ
بسور کر بولی۔

”کوئی نہیں، اتنی اچھی ہے۔ آپ حوا خواہ اس
سے چڑتے ہیں؟“
”خواہ خواہ چڑتا ہوں؟“

”اچھا بس جانے دیں، میں منع کر دوں گی اسے
آئندہ آپ کے کمرے میں نہیں آئے گی؟“ روٹی کے
غفل سے کہنے پر وہ بھی ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”خدا را آئے اس گھر میں آنے سے ہی منع کر
دو۔“

”گھر میں آنے سے کیوں منع کر دیں۔ بس آپ کے
کمرے میں نہیں آئے گی؟“ روٹی کہتی ہوئی چلی گئی اور وہ اتنی
دیر تک اپنے آپ سلگتا رہا۔

پھر اگلے دن سے وہ اسے گھر میں تو کیا روٹی کے
ساتھ کالج جاتے ہوئے بھی نظر نہیں آئی، جس سے وہ

پھر بھی وہ اسے اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جاتا تھا۔ آج
تو محض نئی جگہ کی وجہ سے پھر اماں نے بھی کہا تھا اس
لیے وہ اس کے ساتھ نکلا۔ اور اب بہر حال اطمینان سے
ہو گیا کہ روٹی کو سامتی مل گئی تھی۔ اسٹاپ پر وہ اتنا دلا
سے تھامے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ روٹی نے دیکھا تو
قریب آکر بولی۔

”بھائی! اگر آپ کی پس پہلے آجائے تو آپ چلے
جائیے گا، میرے ساتھ چلی ہے۔“

”تلی!“ وہ پہلے چونکا پھر فوراً یاد آنے پر بے ساختہ
ہنسا۔ ”جی بھی وہ قریب آکر براہ راست اس سے بولی۔
”کون سا ٹوٹھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں آپ؟“
اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے، جبکہ روٹی سننے لگی
تھی، تب وہ اسے بُری طرح گھورتا ہوا بھاگ کر
بس میں سوار ہو گیا۔

عجب چکنا چڑھائی لڑکی تھی۔ کسی بات کا اس پر
کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ کچھ سر پھری بھی لگتی تھی، جب
چاہے منہ اٹھائے چلی آتی، دن دیکھتی نہ رات، گھنٹوں
کے حساب سے روٹی کے پاس بیٹھی رہتی اور کوئی
پوچھنے بھی نہیں آتا تھا۔ اور اگر اسی حد تک رہتی تو چلو
گوارا کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اب تو وہ دھڑلے سے
اس کے کمرے میں بھی آجاتی۔ خواہ خواہ کتابوں کو پھیرنا
پھر اس سے بے تلکے سوال۔ اور پہلے دو تین دن تو وہ
جہاں اس کے کمرے میں داخل ہوتی، وہ باہر نکل گیا۔
غصہ اس خیال سے کہ اماں اور روٹی کیا سوچیں گی۔
لیکن جب وہ لڑکی ہو کر اس بات کو کوئی اہمیت نہیں
دے رہی تھی تب وہ بھی ڈھیٹ بن گیا۔ لیکن جتنی
دیر وہ اس کے کمرے میں رہتی، اس کا سارا وقت
خود پر قابو پانے میں گزرتا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہاں
ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا وہ اسے اٹھا کر باہر پھینک
دے گا۔ یعنی حد تھی۔ وہ کہتا میری کسی کتاب کو ہاتھ
مت لگانا۔ اور وہ ایک میں سے ساری کتابیں نکال
کر بیڈ پر پھیلا دیتی۔ اس وقت بڑے آرام سے اس
کی الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔ تو وہ جم جم کر اماں
کو پکارنے لگا۔ اور اماں کے ساتھ روٹی بھی گھر کر
جائی چلی آئی۔

یہی سمجھا کہ روپی نے اُس سے دوستی چھوڑ دی ہے۔ اور اس بات پر اُسے گہرا اطمینان ہوا۔ حقیقتاً وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ دن — میں زیادہ وقت تب ہی اُسے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔ اُسے گالیاں دیتے گزرتا تھا۔ جس پر کسی کسی وقت وہ خود جھنجھلا جاتا۔ بہر حال اب بہت اطمینان سے تھا۔ دوڑا رہا تھا کہ وہ لپک کر قریب آگئی۔ اور بہت — اور موڈ بھی پہلے کی طرح خوشگوار۔ مزید اُٹانے اُسے بائیک خریدنے کے لیے پیسے بھیجے تھے اُس پر وہ بہت خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

”اب صبح صبح بسوں میں دھکے نہیں کھانے پڑیں باوجود وہ بڑی ڈھٹائی سے فوراً اُچک کر اُس کے گے، آرام سے بائیک پر جاؤں گا۔ اور ہاں روپی نہیں بھی کوئی برا بھلا نہیں ہوگی“

”مجھے اب بھی کوئی برا بھلا نہیں ہوتی بھائی، میں آرام سے بلی کے ساتھ چلی جاتی ہوں، روپی کے منہ سے لولا۔ پھر اُس کا نام سن کر وہ کچھ ٹھٹھک گیا۔ اور قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

”فوراُ اُتر جاؤ!“

”کیوں کیا ہوا؟“ اُس کے سادگی سے پوچھنے پر وہ اکیدم ہی آپسے باہر ہو گیا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی، کیا لگتا ہوں میں تمہارا جویوں میرے ساتھ بیٹھ گئی ہو؟“

وہ اُتر کر ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اُس نے زن سے بائیک بھگا دی۔ سارے موڈ کا سٹیانا س ہو گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تب بھی بُری طرح تپا ہوا تھا۔ روپی نے خوش ہو کر بائیک کی مبارکباد دی۔ لیکن وہ اُن سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ روپی بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔

”واہ بھائی! بڑے ہوشیار ہیں، پہلے ہی سے موڈ خراب کر لیا کہ کہیں میں بائیک پر گھمانے کی فرمائش نہ کروں؟“

”اس وقت بات نہیں کرو مجھ سے، میرا موڈ بہت خراب ہے“ وہ کمرے پر نہ دیکھتے ہوئے بولا۔ اور جھک کر جوتے موزے اُتارنے لگا۔

”کیا ہوا، گئے تو بہت خوش تھے؟“ روپی نے اچھنبے سے پوچھا۔ تو وہ چمڑک کر بولا۔

”آتے ہوئے بھی بہت خوش تھا۔ لیکن وہ کم بخت بھوری بلی نے راستہ کاٹ کر سارا موڈ خراب کر دیا“

”ہائیں! کالی بلی کے راستہ کاٹنے کا تو سنا تھا۔

یہ بھوری بلی، روپی نے تعجب سے آنکھیں بھاڑتے ہوئے کہا تو وہ نخت سے سر جھٹک کر رہ گیا اور اس کے اس انداز سے روپی سمجھ کر بولی۔
 ”ارے، کہیں آپ بلی کی بات تو نہیں کر رہے؟ کہاں ملی تھی آپ کو؟“
 ”کم جنت کہیں راستے میں کھڑی تھی۔ سنگل پر رک کا تو فوراً آکر میرے پیچھے بیٹھ گئی۔“
 ”تو اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ اس بیچاری کو بھی تو یہیں آنا تھا؟“
 ”بکومت۔ اور یہ اماں کہاں ہیں؟“ روپی کی اس سے ہمدردی پر وہ مزید سلگ گیا۔

”اماں اور بلی کی امی کے پاس گئی ہیں؟ روپی بتاتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی اور وہ خواجواہ چڑھنے لگا، کیونکہ روپی نے اس پر کچھ بتایا نہیں تھا۔ لیکن اسے یہی لگا، جبھی چڑ کر دانت پیسنے لگا۔
 ”بلی۔ بلی کی امی، بلی کا پورا خاندان۔ لا حول ولا“
 پھر وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ اسے کہیں اور مکان تلاش کرنا چاہیے اور یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں تھا۔ لیکن رات میں جب اس نے اماں کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے صاف منع کر دیا۔

اب بار بار گھر بدلنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں سے انشاء اللہ وہ اپنے ہی گھر جائیں گی۔ روپی نے بھی ان کی تائید کی اور اس وقت وہ خاموش ہو گیا۔ زیادہ زوریوں نہیں دیا کہ امتحان قریب تھے اور ابھی اسے کیسوی سے پڑھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن سارا مسئلہ تو یہی تھا کہ وہ کیسوی سے پڑھ نہیں پاتا تھا۔ اور یہ بات وہ اماں کو کیسے سمجھائے جن کا کہنا تھا کہ اس نے خواجواہ اس لڑکی کو اپنے حواسوں پر سوار کر لیا ہے۔

بہر حال اس نے سوچ لیا کہ امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی وہ کہیں اور گھر تلاش کرے گا۔ خواہ اماں مانیں یا نہ مانیں، پھر وہ بہت کوشش سے ہر بات ذہن سے جھٹک کر امتحانوں کی تیاری میں لگ گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ان دنوں وہ نظر نہیں آرہی تھی، ہو سکتا ہے اس کی غیر موجودگی میں روپی کے پاس آتی ہو، اس بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ پھر

امتحانوں کے دوران تو اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ کھانا، پینا، سوناٹک بھول گیا تھا۔ جس روز آخری پیپر دے کر نوٹادروازے ہی سے چلانے لگا۔
 ”اماں! بہت سخت بھوک لگی ہے اور نیند بھی بہت آرہی ہے“

روپی نے فوراً کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”اب تو لمبی تان کر سوئیں گے“

”ظاہر ہے۔ اور دیکھو شام میں بھی مجھے مت اٹھانا، بس اب کل صبح ہی اٹھوں گا۔“ وہ جلدی جلدی نوٹے منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”یا اللہ اتنی دیر تک سوئیں گے، یعنی اٹھا رہ گھنٹے؟“ روپی نے حیرت بھری آواز نکالی پھر کہنے لگی۔
 ”نہیں بھائی شام میں، میں آپ کو اٹھا دوں گی، پھر تایا جی کے گھر چلیں گے۔“

”آج نہیں؟“ وہ کہہ کر دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ایک بار پھر اسے شام میں نہ اٹھانے کی تاکید کر کے اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ اماں اور روپی تایا جی کے گھر جانا چاہتی تھیں لیکن وہ جانے پر تیار نہیں ہوا۔ اماں ناراض بھی ہوئیں کہ وہ محض اس کی وجہ سے رُکی ہوئی تھیں کہ وہ امتحانوں سے فارغ ہوئے پھر ساتھ جائیں گے پھر بھی اس نے منع کر دیا۔ تب اماں روپی کے ساتھ چلی گئیں۔

وہ اتنے دنوں کی ٹینشن سے آزاد ہوا تھا۔ اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر میوزک سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اپنی بائیک آنگن میں لا کر اسے دھونے جگہ کے میں لگ گیا، اس کام میں اس نے پورے دو گھنٹے صرف کیے۔ اقدار آخر میں جب وہ اپنی چمکتی ہوئی بائیک کو دھوا دھرتے گھوم کر بہت شوق سے دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت اوپر سے قدرے گدلا پانی یوں برساکہ اس کی دو گھنٹے کی محنت تو اکارت گئی ہی وہ خود بھی اس میلے پانی میں نہا گیا۔
 اس افشاں پر اس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا اور اس

کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ خالی بالٹی اُس کے ہاتھ سے نیچے بھول رہی تھی اور وہ اُسے دیکھ کر سنس رہی تھی اُس کے دیکھنے پر مزید اُس کا منہ چڑھ گیا پھر اور زور سے سنسی تو وہ اس بدتمیزی پر کھولتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آیا تو پہلے مرحلے پر اُس کی امی سے سامنا ہو گیا۔ جس سے وہ نہ صرف ٹھٹھک کر رکا بلکہ اپنے گیلے حیلے کے باعث پریشان بھی ہو گیا۔

”آؤ بیٹا! رک کیوں گئے، اندر جاؤ“ پتا نہیں انہوں نے اُسے ٹھیک سے دیکھا نہیں یا قصداً۔ نظر انداز کر گئیں۔ اور وہ ایک ہاتھ سے بالوں کا پانی بھاڑتے ہوئے بس اسی قدر کہہ سکا۔

”جی وہ!“ تب ہی وہ کھلکھلاتی ہوئی سلمنے آگئی۔

”ارے، تم کیا نہاتے میں سے اُٹھ کر آگئے ہو؟“ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر اُس کی امی سے بولا۔

”آئی! ذرا اوپر سے پانی احتیاط سے پھینکا کریں۔ میں نیچے کام کر رہا تھا“

”ہائیں!“ اُس کی امی حیران ہوئی پھر بیٹی کو کھسکتے دیکھ کر معاملہ سمجھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ بلی کی شرارت ہوگی، بیٹا! تم برا نہیں ماننا یہ ذرا۔ تم اندر تو آؤ۔“

”بس آنٹی! چلتا ہوں۔ نیچے گھر کیلا ہے اور شاید میں دروازہ بھی کھلا چھوڑ آیا ہوں“

”کیوں، غتاری اماں اور روٹی کہاں ہیں؟“

”وہ تاجی کے ہاں گئی ہیں۔ اچھا میں چلوں“

وہ اپنے حیلے کے باعث جلد سے جلد جانا چاہتا تھا جیسے ہی پلٹا وہ پھر روک کر بولیں۔

”اچھا سنو، کھانا یہاں آکر کھانا!“

”جی شکریہ، میں!“

”نہیں نہیں، باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہیں آجاتا“

انہوں نے اصرار سے کہا تو وہ کوئی جواب دیے بغیر جلدی سے سیڑھیاں اُتر آیا۔ اپنی بائیک کو دیکھ کر اس کے اندر نئے ہرے سے آبال اُٹھنے لگا۔ جتنی گالیاں یاد تھیں سب اُس کے نام کیں پھر ایک ہی بار بائیک پر پانی بہا کر نہانے چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو

اُسے اپنی بائیک کو کپڑے سے صاف کرتے دیکھ کر ہاتھ سے نیچے بھول رہی تھی اور وہ اُسے دیکھ کر سنس رہی تھی اُس کے دیکھنے پر مزید اُس کا منہ چڑھ گیا پھر اور زور سے سنسی تو وہ اس بدتمیزی پر کھولتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آیا تو پہلے مرحلے پر اُس کی امی سے سامنا ہو گیا۔ جس سے وہ نہ صرف ٹھٹھک کر رکا بلکہ اپنے گیلے حیلے کے باعث پریشان بھی ہو گیا۔

”آؤ بیٹا! رک کیوں گئے، اندر جاؤ“ پتا نہیں انہوں نے اُسے ٹھیک سے دیکھا نہیں یا قصداً۔ نظر انداز کر گئیں۔ اور وہ ایک ہاتھ سے بالوں کا پانی بھاڑتے ہوئے بس اسی قدر کہہ سکا۔

”جی وہ!“ تب ہی وہ کھلکھلاتی ہوئی سلمنے آگئی۔

”ارے، تم کیا نہاتے میں سے اُٹھ کر آگئے ہو؟“ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر اُس کی امی سے بولا۔

”آئی! ذرا اوپر سے پانی احتیاط سے پھینکا کریں۔ میں نیچے کام کر رہا تھا“

”ہائیں!“ اُس کی امی حیران ہوئی پھر بیٹی کو کھسکتے دیکھ کر معاملہ سمجھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ بلی کی شرارت ہوگی، بیٹا! تم برا نہیں ماننا یہ ذرا۔ تم اندر تو آؤ۔“

”بس آنٹی! چلتا ہوں۔ نیچے گھر کیلا ہے اور شاید میں دروازہ بھی کھلا چھوڑ آیا ہوں“

”کیوں، غتاری اماں اور روٹی کہاں ہیں؟“

”وہ تاجی کے ہاں گئی ہیں۔ اچھا میں چلوں“

وہ اپنے حیلے کے باعث جلد سے جلد جانا چاہتا تھا جیسے ہی پلٹا وہ پھر روک کر بولیں۔

”اچھا سنو، کھانا یہاں آکر کھانا!“

”جی شکریہ، میں!“

”نہیں نہیں، باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہیں آجاتا“

انہوں نے اصرار سے کہا تو وہ کوئی جواب دیے بغیر جلدی سے سیڑھیاں اُتر آیا۔ اپنی بائیک کو دیکھ کر اس کے اندر نئے ہرے سے آبال اُٹھنے لگا۔ جتنی گالیاں یاد تھیں سب اُس کے نام کیں پھر ایک ہی بار بائیک پر پانی بہا کر نہانے چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو

ساتھ ہی وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے، تب وہ آگے آکر بولی۔

”ایو، یہ شاہجہان ہے، ردی کا بھائی، میڈیکل میں پڑھتا ہے اور مجھے تو ابھی سے ان بھائی سے مرلیضوں پر ترس آنے لگا ہے جو اس کے ہاتھوں سے شفا یاب ہوں گے۔“ وہ فوراً بول پر طعنے پر وہ زور سے ہنسی سراسر مسخرانہ ہنسی تھی۔

”بیٹیو بیٹیا! کھڑے کیوں ہو؟“ انہوں نے اُس سے کہا تو وہ کرسی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا تبھی امی اندر آتے ہوئے بولیں۔

”آگے شاہجہان، چلو پہلے کھانا کھا لو۔“ جی، اُسے اپنے بلانے کا مقصد اب سمجھ میں آیا۔ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”شکر یہ آٹی مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”کھانے کا وقت ہے، بھوک کیسے نہیں ہوگی۔“ بلی جاؤ کھانا نکالو۔“

ان کے کہنے پر وہ چلی گئی۔ اور کچھ دیر بعد دیپ سے پیکار نے لگی کہ کھانا لگ چکا ہے آجائیں، تب وہ ناچار اُس کی امی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے اُسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس لڑکی کو بہت بُری طرح جھڑک کر اپنے گھر سے بھگا چکا تھا۔

”کھاؤ بیٹیا! تکلف نہیں کرو، اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔“ اُس کی امی کے محبت بھرے اصرار پر اُس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا، جس پر وہ کہنے لگی۔

”ارے جس حساب سے چلاتے ہو، کھانا بھی اُسی حساب سے کھا یا کرو۔“

”تم چیپ رہو۔“ امی نے اُسے لڑکا، پھر اُس سے پوچھنے لگیں۔ ”تمہارے امتحان ختم ہو گئے؟“ جی، کل آخری بیس رہا تھا۔“

اللہ کامیاب کرے نہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میری بیٹی بڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے لیکن اس کا پڑھنا میں اتنا دل نہیں لگتا پھر بیجاری باپ کی بیماری سے بھی پریشان رہتی ہے۔ انہوں نے اُسے دعا دیتے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا ہے انکل کو، کب سے بیمار ہیں؟“

”چار، پانچ سالوں سے، ایسے ہی پلنگ پر پڑے ہیں، پہلے صرف بائیں جھٹے پر فافج ہوا تھا۔ اور ہم نے تو اپنی طرف سے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن جانے خدا کو کیا منظور ہے کہ بجائے افادہ ہونے کے مرض بڑھتا ہی گیا۔ ابھی پچھلے دنوں پورے پندرہ دن ہسپتال میں رہ کر آئے ہیں، تمہیں تو پتا ہی ہو گا۔“

”جی!“ اس نے مارے ندامت کے سر جھکا لیا، کیونکہ وہ تو سرے سے اُن کے وجود سے ہی بے خبر تھا۔ اور وہ کہنے لگیں۔

”ایسے حالات میں یہ بے چاری کہاں پڑھائی میں دل لگا سکتی ہے۔ ہسپتال آنا جانا، پھر ان کی دیکھ بھال، اسے تو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔“ اتنے دن ہسپتال رہے، کچھ فرق نہیں پڑا۔ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟“ اُس نے پوچھا تو امی سے پہلے وہ بول پڑی۔

”کوئی اچھی اُمید نہیں دلاتے۔ پاگل ہیں سب ڈاکٹر۔“

”بلی!“ امی نے تنبیہی لہجے میں ٹوکا تو وہ سر جھٹک کر وہاں سے اٹھ گئی، تب امی اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر اُسے کھانے پر اصرار کرنے لگیں، لیکن وہ ہاتھ کھینچ چکا تھا۔ سہولت سے منع کر دیا اور وہاں سے اٹھ کر کچھ دیر اُس کے ایو کے پاس بیٹھا پھر بیچے آگیا۔ شام تک وہ تنہائی اور خاموشی سے خاصا اکتا چکا تھا اور اُسے امان اور روی پر غصہ آنے لگا کہ انہیں سارا دن وہاں رہنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ دوپہر تک اُس کے بعد واپس آجائیں۔ اُن کے انتظار میں وہ کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اصل میں تو اُسے یہ پابندی کھل رہی تھی، جیسی جھنجھلائے جارہا تھا۔ لیکن اُس وقت اس کی سادی جھنجھلاہٹ اور کوفت دور ہو گئی، جب اماں اور روپ کے ساتھ بیٹی کو آتے دیکھا۔ لپک کر اُسے گود میں اٹھالیا۔ پھر اماں سے بولا۔

”اتنی دیر لگا دی اماں!“ اس بیٹی کی وجہ سے دیر ہو گئی، ساتھ آنے کی

ضد کر رہا تھا۔ اور تمہاری آپائیاں کی اجازت کے ہوئے بولوا۔

بغیر بھیجنے کو تیار نہیں تھیں، ابھی آیا عرفان تو اُس سے پوچھ کر لے آئے اسے۔
 ”نہیں آئے گا یہ تمہارے پاس۔ اور یہ تم صبح صبح یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“
 اماں نے تھکے تھکے انداز میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔
 ”دیکھا پھر اسے دیکھ کر بولی، تمہارا دیدار کرنے آئی پھر کہنے لگیں۔“

”تم سارا دن یہاں کیا کرتے رہے وہیں آجاتے تھی صبح صبح“
 تمہارے اتایا جی بھی بوجھ رہے تھے۔
 ”ہو آؤں گا کسی دن“ وہ لا بردا لی سے کہہ کر
 بنی کو گدگد کرنے لگا۔ بچے اپنی ذات میں الجھن ہوتے گیا۔

ہیں۔ بنی کے آنے سے اچانک اتنی رونق ہو گئی، رات کتنی دیر تک وہ اور رونی اُس کے ساتھ لگے رہے اور بتا چکی ہوں کہ مجھے برا ماننا نہیں آتا، وہ اُس کے جب سونے کا مرحلہ آیا تو دونوں بنی کو اپنے ساتھ سلائے ہوئے بیٹھنے پر بولی۔
 ”لیکن بچے نے دونوں کو ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔“

”میں نانی اماں کے پاس سوؤں گا؟“
 ”لو اس نے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔ جاؤ سلاؤ اسے اندر لے لایا اور بنی کو اُس کی گود میں دے کر جلدی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔“

وہ یوں روٹھے لہجے میں بولا جیسے اُسے بنی کا فیصلہ پسند نہ آیا ہو۔ اور رونی ہنستی ہوئی اُسے اٹھا کر چل گئی۔
 پھر منہ ہاتھ دھو کر نکلا تو قصداً اُسے نظر انداز کر کے اماں کو پکار کر ناشتے کے لیے کہا اور اختیار لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اب بنی کے ساتھ آرام سے بیٹھی اکڑ بکڑ کھیل رہی تھی۔ اماں ناشتہ لے کر آئیں تو اُس نے اختیار ایک طرف رکھ دیا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”رونی کہاں ہے؟“
 ”کالچ گئی ہے“ اماں نے بتایا تو وہ بلا ارادہ اُسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”تم کیوں نہیں گئیں کالچ؟“
 ”میرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اب پوچھو، میرا کس بات میں دل لگتا ہے؟“

”کیوں نہیں کیوں پوچھوں؟“ وہ بات ہی غصہ دلانے والی کرتی تھی اماں کا خیال کیے بغیر وہ تنک کر بولوا۔

”لو پوچھنے میں تمہارا کیا جاتا ہے؟“ وہ انتہائی معصوم بن کر بولی۔ ”اچھا خیر میں خود ہی بتاتی ہوں۔“

”میرا دل؟“
 ”اماں!“ وہ چیخ پڑا محض اس خیال سے کہ کہیں

”یہ خوش ہو رہا ہے، سہم کر رہ گیا ہے۔“
 ”کوئی نہیں اتنا خوش ہو رہا تھا۔ اب تمہاری گود میں جا کر سہم گیا ہے۔ لاؤ ادھر دو۔“ اُس نے بنی کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو وہ پیچھے ہٹتے

اس قدر کہا تھا کہ اُس نے ایک دم اسپید بڑھادی۔
اور منٹوں میں گھر آگیا۔
”بنٹی کہاں ہے؟“ اندر آتے ہی اُس نے اماں
سے بنٹی کا پوچھا۔

”تلی اُسے اوپر لے گئی ہے۔“
”کیوں، میرا مطلب ہے آپ نے کیوں اُسے
لے جانے دیا؟“ اماں کو اُس کی بات پر غصہ آگیا۔
”تو کیا منع کرتی، بچہ خود ہی اُس کے ساتھ لگا
ہوا تھا۔ اور یہ تم کیوں ذرا ذرا سی بات پر آپ سے
باہر ہونے لگے ہو، اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھو۔“
وہ ایک دم خاموش ہو کر اپنے کمرے میں آگیا۔
دیر بعد روٹی کھانے کا پوچھنے آئی تو اُس نے منع
کر دیا۔

”اماں بتا رہی ہیں، آپ نے صبح ناشتا بھی نہیں
کیا۔؟“

”بھیرے؟“ اب کے اُس کے انداز میں غصے کے
بجائے ناراضگی تھی، جیسے کوئی بچہ ماں کی ڈانٹ
پر روٹھا ہوا ہو۔ روٹی اپنی بے ساختہ مسکراہٹ
ہونٹوں میں چھپا کر اُس کے پاس چلی آئی۔

”بھیرے کہ اب کھانا کھائیں۔“
”بھوک نہیں ہے، جب لگے گی کھالوں گا۔“
”ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتی ہوں، پھر ساتھ
ہی کھائیں گے۔“ روٹی کہتے ہوئے اُس کے پاس بیٹھنے
لگی کہ وہ روک کر بولا۔

”یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ اپنے
کمرے میں۔“
”ارے، مجھ سے کیا ناراضگی ہے، میں نے کیا
کیا ہے؟“

”کچھ نہیں کیا تم نے، بس جاؤ۔ اور سنو اماں سے
اجازت لے کر بنٹی کو اوپر سے لے آؤ۔ بیچارہ پریشان
ہو رہا ہوگا۔“

وہ جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ تب روٹی
اُس کے ٹوکنے کی پرواہ نہ کرتی ہوئی اُس کے پاس
بیٹھ کر بولی۔

”بنٹی کو تو میں لے آؤں گی، پہلے آپ میری ایک
بات مائیں۔“

وہ کچھ اٹا سیدھا نہ بک دے کیونکہ اُس سے ہر قسم
کی بات متوقع تھی۔
”خدا کے لیے اسے خاموش کراؤں یا اس سے کہیں
جائے ہاں سے؟“

”پہنچ کیوں رہے ہو، وہ اتنے آرام سے بات
کر رہی ہے۔“ اماں اٹا اُسے ٹوکنے لگیں۔
”باگل ہوں ناں میں جو پیچ رہا ہوں؟“ وہ ناشتا
چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اماں پکارتی رہ گئیں۔ لیکن
وہ بائیک لے کر نکل گیا۔ تب اماں اُس سے کہنے
لگیں۔

”بنٹی! برا نہیں ماننا، یہ یونہی بات ہے بات
غصہ کرتا ہے۔“ اور وہ اُن کے گلے میں بازو ڈال کر
لجابت سے بولی۔
”میں برا نہیں مانتی اماں!“

دوپہر تک وہ یونہی ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہا
پھر واپس آتے ہوئے اچانک روٹی کا خیال آیا تو
وہ اُسے لینے اس کے کالج جا پہنچا۔ وہ اُسے دیکھ کر
حیران کم پریشان زیادہ ہو گئی۔ کیونکہ اُس کی اتنی منٹوں کے
باوجود بھی وہ اُسے کالج لانے لے جانے پر آمادہ نہیں
ہوا تھا۔

”خیریت تو ہے بھائی!“ اس کے پریشانی سے
پوچھنے پر وہ چپ کر بولا۔

”ایک میں خیریت سے نہیں ہوں باقی سب
بخیریت ہیں۔“

”آپ؟“ روٹی نے سرتاپا اُسے دیکھ کر روٹی زبان
میں پوچھا۔ ”کیا ہوا آپ کو؟“

”باگل ہو گیا ہوں میں اور مجھے باگل کرنے والی
وہ چٹائی جنگلی تھی۔“

وہ جلے بھنے انداز میں کہہ کر آخر میں بڑبڑانے
لگا۔ جبکہ روٹی اطمینان کا سانس لیتی ہوئی اُس کے پیچھے

بیٹھ گئی، پھر پہلے اُس نے بائیک اسپید سے بھگائی
پھر اچانک رفتار دھیمی کرتے ہوئے بولا۔

”سنو روٹی! مجھے لگتا ہے وہ لڑکی ہم سے گھر
خالی کرنا چاہتی ہے۔ جب ہی اتنا عاجز کر رہی ہے۔“

”کوئی نہیں بھائی! آپ تو خوا خواہ؟“ روٹی نے

”کیا؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور وہ کچھ حیران ہوئی ہوئی بقیہ سڑھیاں اتر کر باغیچے
”تلی سے دوستی کر لیں“ میں آکھڑی ہوئی۔ اور بغور اُسے دیکھ کر بولی۔
”کیا؟“ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ لیکن روی اکی
”تم شاہجہان ہی ہونا؟“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں تمہیں کوئی اور
طرح رستان سے کہنے لگی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی! جب تک آپ نظر آ رہا ہوں“
”اُس سے پڑھتے رہیں گے، پیچیں گے چلائیں گے“
”وہ اسی طرح آپ کو تنگ کرتی رہے گی، دوستی کر لیں“
”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ناممکن، زہر لگتی ہے وہ مجھے، اس کو ذرا“
”احساس نہیں، گھر میں باپ بیمار پڑا ہے اور وہ“
”سارے غلے میں دوستیاں کرتی پھرتی ہے“
”وہ انتہائی ناگوار لہجے میں بولا تو روی مزید“

”کچھ کہتے کا ارادہ ترک کر کے اٹھ کھڑی ہوئی پھر“
”جائے جاتے رک کر بولی تھی۔“
”میرے مشورے پر غور کریں، فائدے میں
”رہیں گے“

”اُس نے نخوت سے سر ہٹک دیا۔ اُس وقت
”وہ روی کے مشورے پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔“
”جب اگلی صبح وہ سڑھیوں پر کھڑی ہاتھ میں چھوٹا سا
”آئینہ لیے اُس کے چہرے پر عکس ڈال رہی تھی۔“
”وہ نیند میں تھا اور اُس کی اس حرکت پر ہی اُس کی
”آنکھ کھلی تو پہلے وہ سمجھ نہیں پایا کہ اُس کے منہ پر اتنی
”روشنی کہاں سے آ رہی ہے، جب کھڑکی سے باہر نظر
”گئی تو وہ سڑھیوں پر کھڑی نظر آئی اور اُس کے ہاتھ
”میں آئینہ دیکھ کر حقیقتاً اُس کا دماغ گھوم گیا۔ دل چاہا
”ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اُسے فوراً قتل کر دے مزید
”اُس کی کھلکھلائی ہنسی نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔“

”وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اُس تیزی سے کمرے
”سے نکلا لیکن اُس تک پہنچنے سے پہلے ہی روی کی بات
”اُس کی سمجھ میں آگئی تو برآمدے ہی سے واپس پلٹ کر
”کمرے میں آیا۔ پھر کھڑکی کے پاس آ کر اُس سے بولا۔“

”صبح بخیر!“
”ہیں۔“ وہ چونکی۔ ”مجھ سے کچھ کہا؟“
”ظاہر ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں؟“
”حقیقتاً اُسے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے میں بہت دقت
”ہو رہی تھی کیونکہ دل تو تچا رہا تھا اس کا منہ تو رُطد سے۔“

”کیونکہ روزانہ رات میں وہ اگر کھڑکی نہیں بھی بند
”کرتا تو ہر دے ضرور برا کر دیتا تھا۔“
”ایک تو یہ خیال کہ صبح سویرے کی کرنیں براہ راست
”اُس کے چہرے پر نہ پڑیں اور اس سے زیادہ۔“
”بے پردگی کا خیال تھا۔ لیکن رات جانے کیسے وہ معمول
”کیا اور اپنی معمول کا خیال وہ صبح ہی صبح بھگت رہا
”تھا۔ وہ کتنی دیر کھڑی فصول باتیں کرتی رہی جب اوپر
”سے اُس کی امی نے پکارا تبت گئی۔ اور اُس کے جلنے
”ہی اُس نے کھڑکی بند کر کے پردے براہر کیے اور دوبارہ
”سونے کے لیے کیٹ گیا۔ لیکن اب کہاں نیند آتی۔“

”کم بخت پوری نیند اچاٹ۔ کر گئی تھی۔“
”کچھ دیر کر وہیں بدل کر وہ اُسے کوستا ہوا اٹھ کھڑا

”کیا ضرورت تھی اس آفت کو ساقط لانے کی؟“
 اور روٹی کو بھی غالباً عجیب سا لگ رہا تھا۔ جیسا کہ اُس کی
 طرف داری میں کچھ نہیں بولی۔
 پھر گھر آکر بھی اُس نے سارا غصہ روٹی پر ہی
 اتار دیا۔ اُس سے کچھ کہنا تو گویا پھر اپنی شامت بلانا
 تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اُس کی کلاسز
 شروع ہوئیں تو وہ پھر سے پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔
 اب تو اُس کا آخری سال تھا اور یہ بھی غنیمت تھا۔
 کہ وہ اس سرپھری لڑکی کو کچھ سیٹ کرنے میں کامیاب
 ہو گیا تھا۔ یعنی وہ جب بھی آتی، وہ خود پر جبر کر کے
 ہی تھی اُس سے ہلکے پھلکے انداز میں چند باتیں کر لیتا
 اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتی
 تھی، اور جب وہ اس کے کمرے میں آتی تو اس وقت
 بھی خواہ وہ کتنا ضروری کام کر رہا ہوتا چھوڑ کر اس کی
 طرف متوجہ ہو جاتا۔ اُسے ٹھننے کو کہتا پھر ادھر ادھر کی
 باتوں کے دوران جیسے اچانک یاد آنے پر کہتا کہ وہ
 بہت ضروری کام کر رہا تھا۔ اور بجائے اُس کے خود
 اپنے آپ کو الزام دیتا کہ اُس سے باتوں میں لگ
 کر وہ سب بھول جاتا ہے۔ تب وہ خود ہی اُلجھ کر چلی
 جاتی، جس پر وہ دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے پھر پڑھنے
 میں لگ جاتا۔ اس وقت بھی اُس نے اپنا یہی حربہ
 استعمال کیا۔ لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کیا
 بات تھی کچھ چپ چپ سی بھی لگ رہی تھی۔ وہ یہی
 سمجھا اپنے کسی خیال میں کہ اُس کی بات نہیں سن رہی
 جب ہی اُسے متوجہ کر کے کہنے لگا۔

”کل میرا ٹیسٹ ہے اور میں نے کچھ تیاری نہیں
 کی۔ کیا کروں تم سے باتوں میں لگ کر تو سب پڑھنا
 پڑھنا بھول جاتا ہوں، آخری سال ہے، پتا نہیں
 میرا کیا ہوگا؟“

”انشاء اللہ، گزشتہ کی طرح شاندار کامیابی حاصل
 کرو گے“ اُس نے بڑے خلوص سے کہا تو وہ اندر ہی
 اندر جزبہ نہ ہو کر بولا۔

”کچھ پڑھوں گا تب ناں!“

”تو تم اپنی تیاری کرو، میری طرف دھیان مت

ہوا اور کمرے کی سینک بادلنے کے بارے میں غور
 کرنے لگا۔ لیکن جس رخ پر بھی پلنگ رکھنے کا سوچتا
 کھڑکی سامنے ہوتی، تب وہ اُس پر لعنت بھیجتے ہوئے
 کمرے سے نکل آیا۔
 شام میں روٹی کی بہت نشوں کے بعد جب وہ
 اُسے اور بنٹی کو کلفٹن لے جانے پر آمادہ ہوا اُنسی
 وقت آپا اور عرفان بھائی بنٹی کو لینے آ گئے۔ وہ خوش
 ہو کر روٹی سے بولا۔

”اب تو نہیں جاسکتے۔ آیا آگئیں؟“

”آپ تو جانتے ہی ہیں تھے، ٹھیک ہے آئیدہ
 مجھ سے کوئی کام کہیے گا؟“ روٹی پر وگرام خراب ہونے
 پر سچ مچ روہانسی ہو گئی۔ اتنی مشکل سے اُسے منایا تھا۔
 ”ہائیں! تم کیوں رو رہی ہو؟ عرفان بھائی نے
 اُس کی روہانسی شکل پر مزید اُسے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔
 تو وہ اُنسو چھپانے کی غرض سے جلدی سے کچن میں
 بھاگ گئی۔ لیکن جب آپا کو معلوم ہوا تو انہوں نے
 کھڑے کھڑے دوبارہ پروگرام بنالیا۔ صرف اُس کی خاطر
 اور وہ خوش ہو کر فوراً تیار ہوں۔ اوپر سے کئی کو بھی
 بلالیا، جس پر وہ خاصا برہم ہوا اور ان لوگوں کے ساتھ
 جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن عرفان بھائی نے اُس کا
 ایک عذر نہیں سنا۔

پھر امتاں نے بھی ڈانٹا تو وہ چل تو پڑا لیکن
 تمام راستہ اُس کا موڈ خراب رہا۔ حالانکہ روٹی کے
 مشورے پر عمل کرتے ہوئے صبح وہ ایک طرح سے
 اُس سے دوستی کا آغاز کر چکا تھا۔ لیکن اُس میں کیونکہ
 اسے سراسر اپنا مفاد نظر آیا تھا۔ اس لیے وہ خود پر
 ضبط کر کے اُسے برداشت کر گیا تھا۔ لیکن بار بار وہ
 اُسے اپنے ضبط کا امتحان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ جیسا
 سارا وقت اُس سے دور دور رہا۔ لیکن وہ بھی عجیب
 لڑکی تھی، کسی بھی چیز کو دیکھ کر وہیں سے چلا کر اُسے
 متوجہ کرتی، اور وہ آپا اور عرفان بھائی کے سامنے
 بُری طرح سٹیٹا جاتا۔ بنٹی کو گود میں لے کر جھپے
 پر بیٹھی تو اتنے شور میں بھی اُس کی آواز نمایاں تھی۔
 بس اُس کا نام لے کر پکارے جا رہی تھی۔

”شاہجہان! شاہجہان!“ وہ روٹی کے پاس آکر
 دانت پسینے سے سرگوشی میں بولا۔

دو۔

گو اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے کتاب بند کر کے زور سے مینر پر صبح دی۔ تو وہ سادگ سے پوچھنے لگی۔
”کیا ہوا؟“ وہ تمہارا سر، کہتے کہتے رہ گیا اور قصداً مسکرا کر بولا۔

”کچھ نہیں، پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا۔“
”یہ کیا بات ہوئی، صبح تمہارا ٹیسٹ ہے اچھا میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں، ساری سستی دور ہو جائے گی۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ جلدی سے روک کر بولا۔

”سنو، تم رہنے دو، ایسا کرو، روپی سے کہو، وہ بنا دے گی۔“

”روپی اپنی شرٹ سی رہی ہے۔ میں بنا دیتی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل گئی تو وہ کچھ سوچ کر اماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ چائے لے کر غالباً پہلے اس کے کمرے میں پھر ادھر آئی تو کہنے لگی۔

”تم یہاں آکر باتوں میں لگ گئے، پڑھو گے کب؟“ جواب میں وہ اسے بہت کچھ سناسکتا تھا۔ لیکن بس خاموش ہو کر رہ گیا۔ تو اماں اسے اپنے پاس بلا کر پوچھنے لگیں۔

”تمہارے آبا کی طبیعت اب کیسی ہے؟“
”ٹھیک نہیں ہیں؟ وہ مایوسی سے بولی۔ رات سے بہت تیز بخار ہے اور ابھی تو بتا نہیں کیا اٹا سیدھا بول رہے ہیں، جب ہی میں گھبرا کر یہاں چلی آئی ہوں۔“

”ارے۔!“ وہ اس کی بات سن کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ تمہیں پہلے بتانا چاہیے تھا۔ چلو میں دیکھتا ہوں۔“

”چائے تو پی لو۔!“

”چائے پھر پنی لے گا۔ جاؤ بیٹا! پہلے دیکھ آؤ“

انکل کو یہ

اماں نے کہا تو وہ تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔ اس کے ابو کو واقعی بہت تیز بخار تھا اور اس

وقت غنودگی میں تھے، وہ چیک کرنے کے بعد خود ہی جا کر دوائے آیا۔ پھر کچھ دیر ان کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا رہا اس کے بعد یہ کام اسے سونپ کر نیچے چلا آیا۔ پھر صبح کالج جاتے ہوئے کیونکہ بہت جلدی میں تھا اس لیے بس کھڑے کھڑے انہیں دیکھ آیا۔ البتہ کالج سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد اطمینان سے ادھر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی امی کہنے لگیں۔

”بیٹا! اللہ تمہارے ہاتھوں میں بہت شفا دے۔ تمہاری دہی ہوئی دوائے رات ہی ان کا بخار اتر گیا تھا۔“

”اچھا! اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ وہ اس کے ابو کی طرف متوجہ ہوا اور ان کی کلائی تھام کر پوچھنے لگا۔

”بخار تو اتر گیا ہے۔ لیکن اصل بیماری پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

”وہ بھی پیچھا چھوڑ دے گی، فکر نہیں کریں۔“ وہ ان کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہوئے بولا۔ تو وہ قدرے تلخی سے ذرا سا تنہس کر کہنے لگی۔

”تم ابھی پورے ڈاکٹر نہیں ہوئے، جب ہی ایسا کہہ رہے ہو۔“

”بلی! تمہارا بولنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ امی نے اسے بری طرح گھورتے ہوئے ٹوکا تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی، تب امی اس سے بولیں۔

”اس کی بات کا بُرا نہیں ماننا بیٹا!“

”نہیں آنٹی! اصل میں اس کا قصور نہیں ہے، اتنی طویل بیماری دیکھ کر انسان مایوس ہو ہی جاتا ہے۔ بہر حال آپ فکر نہیں کریں، سول ہاسپٹل میں میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر ہیں میں ان سے بات کروں گا، پھر انکل کو ان کے پاس لے جائیں گے۔“

”سول ہاسپٹل میں ابو پہلے بھی جا چکے ہیں، پورے دو مہینے رہے تھے۔“ وہ پھر بول پڑی۔

”اب میں لے جاؤں گا؟“ وہ کہہ کر فوراً وہاں سے چلا آیا۔ کیونکہ مریم کے سامنے اس کی مایوس کن باتیں اسے سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اور اس کی ناگواری محسوس کر کے ہی وہ کچھ دیر بعد اس کے پیچھے

دو مہینے رہے تھے۔“ وہ پھر بول پڑی۔

”اب میں لے جاؤں گا؟“ وہ کہہ کر فوراً وہاں سے چلا آیا۔ کیونکہ مریم کے سامنے اس کی مایوس کن باتیں اسے سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اور اس کی ناگواری محسوس کر کے ہی وہ کچھ دیر بعد اس کے پیچھے

دو مہینے رہے تھے۔“ وہ پھر بول پڑی۔

”اب میں لے جاؤں گا؟“ وہ کہہ کر فوراً وہاں سے چلا آیا۔ کیونکہ مریم کے سامنے اس کی مایوس کن باتیں اسے سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اور اس کی ناگواری محسوس کر کے ہی وہ کچھ دیر بعد اس کے پیچھے

”ہیں؟“ اُس نے چونک کر دیکھا پھر گہری سانس
 کھینچ کر بولا۔ ”کچھ نہیں“
 ”کچھ نہیں، اتنا تو بول رہی تھی“ روپ نے تعجب
 سے کہا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔
 ”ہاں، سچ بول رہی تھی“

”کیا مطلب؟“
 ”ابھی تو میں خود مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا
 ہوں“ وہ صاف ٹال گیا، پھر بائٹک کی چابی اٹھاتے
 ہوئے بولا۔ ”میں ذرا باہر جا رہا ہوں، اماں کو بتا دینا“
 ”کس طرف جائیں گے، میرا مطلب ہے اگر
 مارکیٹ جانا ہو تو؟“
 ”نہیں، میں ایک اور کام سے جا رہا ہوں“ وہ
 کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

پھر ڈاکٹر احمد کمال سے ملنے، انہیں اُس کے ابو
 کی پچھلی تمام رپورٹس دکھانے اور مزید علاج سے
 متعلق مشورہ و معلومات وغیرہ میں اس کا پورا ایک
 ہفتہ صرف ہوا۔ اس کے بعد اُس نے سراسر اپنی
 ذمہ داری پر اُس کے البو جی کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ
 کرا دیا۔

اپنی ذمہ داری پر یوں کہ وہ کسی صورت تیار
 نہیں تھی۔ اُس کا کہنا تھا پہلے کی طرح سوائے خوری
 کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اور شاید وہ اُس کا احسان بھی
 نہیں لینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اُس کی امی کو آمادہ کرنے
 کے ساتھ یہ یقین دلانے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ
 اگر انکل مکمل صحت یاب نہ ہوئے تو بھی اتنا فائدہ
 ضرور ہوگا کہ بسا کھی یا چھڑی کے سہارے تھوڑا بہت
 چلنے لگیں گے۔ اور مستقل پلنگ پر لیٹے رہنے کی
 نسبت یہ بھی بہت تھا۔

بہر حال انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانے کے بعد
 بھی وہ اگر چاہتا بھی تو ایکدم سے بری الذمہ نہیں
 ہو سکتا تھا۔ دن میں ایک بار انہیں دیکھنے ضرور جاتا۔
 اُس کی امی تو وہیں شوہر کے پاس تھیں اور وہ سارا
 دن کبھی اوپر کبھی نیچے، دوپہر میں وہ خود ہی کھانا بنا
 کر ہاسپٹل میں دے آتی تھی اور غالباً اتنا کہ رات
 میں دوبارہ کھانا بھوانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

چلی آئی۔ اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔
 ”سوری! میں بجائے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے“
 ”مجھے تمہارے شکریے کی کوئی ضرورت نہیں“ اُس
 نے فوراً ٹوک دیا۔

”تمہیں ضرورت ہو نہ ہو، میرا تو فرض بنتا
 ہے کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں!“
 ”اچھا، فرائض پہچانتی ہو اپنے“ وہ طنز آمیز
 لہجے میں بولا۔

”کیوں نہیں، بہت اچھی طرح“
 ”خوب، گویا یہ بھی تمہارے فرائض میں شامل
 ہے کہ بیمار باپ کے پاس بیٹھ کر مایوس کن باتیں کرو،
 تاکہ اُن کے اندر جینے کی جو تھوڑی بہت انگ ہے
 وہ بھی جاتی رہے“

وہ اُس کے زہر خند سے کہنے پر ایکدم ہاتھوں
 میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ لیکن پھر فوراً ہی پھیلوں
 سے آنکھیں رگڑ کر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔
 ”میں کبھی اتنی مایوس نہیں تھی، مجھے ڈاکٹروں نے
 مایوس کیا ہے، جن کے نزدیک مریض سے زیادہ اُس
 کے ساتھ آنے والی سفارش کی اہمیت ہوتی ہے“
 اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ
 روکتے ہوئے بولی۔

”میری بات جھٹلا نہیں سکتے تم۔ اس لیے کہ ابھی
 ابھی خود تم نے اتنے زعم سے کہا کہ البو جی کو سول ہاسپٹل
 اب تم لے کر جاؤ گے۔ تمہارا زعم اس بات کا غماز ہے
 کہ تمہاری وہاں شناسائی ہے۔ اور بنا شناسائی
 والوں کا حال ہمارے جیسا ہوتا ہے۔ گزشتہ چار سالوں
 سے دھکے کھا رہی ہوں، کبھی دو مہینے کبھی پندرہ اور
 کبھی دس دن البو جی کو رکھتے اور پھر لا علاج کہہ کر
 واپس بھیج دیتے ہیں“

وہ کچھ سناٹے میں آکر اُس کی سننے لگی اور وہ
 عجیب لڑکھٹی لہجے میں بھاگ گئی، اُسے بولنے کا
 موقع ہی نہیں دیا اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ اُس
 کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ البتہ سوچنے کو بہت
 کچھ تھا۔ اور وہ پوری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ
 روپ آکر پوچھنے لگی۔
 ”کیا ہوا بھائی؟ یہ بتاؤ کیا کہہ رہی تھی؟“

ان دنوں جانے اُس کا لالہ ابالی بن کہاں چلا گیا تھا۔ گزر کر ڈاکٹر کمال کے کمرے میں آیا۔ تو وہ کسی مریض کے زہ شور مینگامہ نہ بلا وجہ اُسے تنگ کرتا۔ بہت خاموشی، ہمت خاموشی، ہمت خاموشی تھے، اُسے اُنہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کر کے آتی بلکہ رات میں اماں اور روپی کے پاس سوئی دیا۔ اور وہ بیٹھ کر بڑے سکون سے اُن کے فارغ ہونے تھی، لیکن تپا نہیں چلتا تھا کہ وہ بھی موجود ہے۔ اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اُس کی طرف متوجہ اُس کے لیے تھی تو یہ حیران کن بات لیکن وہ خوش ہوئے تو ابتدائی رسمی کلمات کے بعد کہنے لگے۔
 ”مبارکے مریض کی پروگریس اچھی ہے، آہستہ آہستہ امپروونگ کر رہے ہیں، یہ رپورٹس دیکھو۔“
 اُنہوں نے سائیڈ سے ایک لفافہ اٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ جس میں سے وہ فوراً رپورٹس نکال کر دیکھنے لگا، پھر اُن کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اس لیے خلاف معمول دیکھ کر اُس کی اسی فوراً پوچھنے لگیں۔

”خیر تو ہے بیٹا! اس وقت کیسے آئے؟“
 ”بس کالج سے نکلا تو ادھر چلا آیا“ اُس نے فوراً ڈاکٹر سے ملاقات کا نہیں بتایا۔
 ”تمہیں بھی پریشانی ہوتی ہوگی، روزانہ آنے جاتے ہیں؟“
 ”ارے نہیں آنٹی! پریشانی کیسی؟“
 ”اچھا آؤ کھانا کھاؤ، بلی ابھی لے کر آئی ہے۔“
 وہ ٹیبل پر رکھے فن کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں، تب اُس کی نظر اُس پر پڑی، وہ اپنے الو کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے قدرے اُن پر ہلکی جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔

”کیسے ہیں انکل آپ؟“ وہ فوراً اُس پر سے نظریں ہٹا کر پوچھنے لگا۔
 ”ٹھیک ہوں بیٹا! آؤ بیٹھو!“
 ”ادھر آ جاؤ، میت کھانا نکال رہی ہوں؟“ آنٹی نے دوسری طرف اشارہ کیا تو وہ سہولت سے منع کرتے ہوئے لولا۔

”شکریہ آنٹی! کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔“
 ”کیوں، کالج سے آرہے ہو، بھوک تو لگی ہو گی۔؟“
 ”بھوک نہیں ہے، آپ کھائیں، میں جب تک ڈاکٹر سے مل آؤں۔“
 وہ کہتا ہوا جلدی سے باہر آ گیا۔ راہداری سے بولی کہ وہ سیٹھا گیا۔

”وہ بلی ابھی یہیں رکے گی!“
 ”وہ تو چلی گئی، ابھی تھوڑی دیر پہلے نکلی ہے۔“
 اُنہوں نے بتایا تو اُسے قدرے تعجب ہو لیکن ظاہر نہیں کیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ ایک تو گرمی اور پیر سے ٹریفک کا اثر دھام۔ پھر اُسے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے برگردیقہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ دور اسٹاپ پر وہ کھڑی نظر آئی۔ پہلے اُس نے سوچا خاموشی سے نکل جائے، لیکن پھر مڑ کر اُس کے پاس چلا آیا، اور بائیک اُس کے قریب روکتے ہی بولا۔
 ”کچھ دیر میرا انتظار نہیں کر سکتی تھیں!“
 ”کچھ دیر، ارے تم کہتے تو میں ساری زندگی انتظار کرتی۔“
 راستے کا خیال کیے بغیر وہ کچھ ایسے انداز سے بولی کہ وہ سیٹھا گیا۔

”تم نہیں سدھر سکتیں، چلو بیٹھو!“

”نہ بابا، تمہارا کوئی بھروسا نہیں، کچھ آگے جا کر اتار دو گئے!“

”کیا مطلب؟“ اُسے بالکل یاد نہیں تھا۔ اور وہ یاد دلاتے ہوئے بولی۔

”بھول گئے شاہجہان، یہی جگہ ہے جہاں میں تمہارے پیچھے بیٹھی تھی اور کچھ آگے جا کر تم نے مجھے اتارتے ہوئے کہا تھا کہ کیا لگتا ہوں میں تمہارا جو میرے ساتھ بیٹھ گئی ہو۔ اب تم بتاؤ کیا لگتی ہوں میں تمہاری جو مجھے ساتھ بیٹھنے کو کہہ رہے ہو۔“

”لعنت ہے مجھ پر“ وہ اُس کی بات پر بُری طرح سلگ کر خود اپنے آپ کو کوستا ہوا سپیڈ سے بائیک بھگا لے آیا۔

گھر میں داخل ہوا تب بھی ایسے ہی جلا جھنسا ہوا تھا۔ شامت اعمال روٹی نے ٹوک دیا۔

”آج اتنی دیر کر دی، کہاں چلے گئے تھے؟“ جنم میں، وہ چیخ کر بولا۔ تو اماں نے پہلے تعجب سے دیکھا پھر ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

”شاہجہان! کتنی بار کہا ہے بہن سے اس طرح بات نہیں کیا کرو۔“

”سوری۔“ اُسے فوراً احساس ہو گیا۔ معذرت کرتے ہوئے بولا۔

”کیا کروں اماں! باہر اتنی تیز دھوپ ہے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔“

”اچھا جاؤ، منہ ہاتھ دھو لو، روٹی کھانا لاؤ اس کے لیے۔“

اماں نے قصداً بات وہیں ختم کر دی، تو وہ اپنے کمرے میں چلا آیا کپڑے بدل کر اور منہ ہاتھ دھو کر

والپس آیا تو روٹی کھانا رکھ چکی تھی، کر لیے گوشت دیکھ کر اُس کی بھوک چمک اٹھی، بڑے شوق سے بٹھا

اور ابھی پہلا نوالہ منہ میں لیا تھا کہ وہ آگئی۔ اور اُسے دیکھتے ہی اماں کا خیال کیے بغیر ڈھٹائی سے کہنے لگی۔

”اُف کس قدر بے مروت ہو تم! مجھے دیکھ کر منہ موڑ کر چلے آئے۔ اگر ساتھ لے آتے تو تمہاری

بائیک گھس تو نہ جاتی وہ اُس کے سفید جھوٹ پر تلکلا

گیا۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”سوری، میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔“

”ارے واہ دیکھا کیسے نہیں، تم تنے مجھ سے۔“

”اچھا بس کھانا کھانے دو۔“ وہ تیز آواز میں

اُسے مزید بولنے سے روک کر کھانا کھانے میں لگ

گیا۔ تو اماں اُس سے کہنے لگیں۔

”بیٹی! تم بھی کھانا کھا لو۔“

”اس کے ساتھ، تو یہ کہیں اماں! یہ کہے گا کیا

لگتی ہو میری جو میرے ساتھ کھانے بیٹھ گئی ہو۔“

وہ اُس کی بات پر کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

کیونکہ ضبط جواب دے چکا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ

وہ۔ اماں کا خیال کیے بغیر اُسے بالوں سے پکڑ کر باہر

دھکیلتا خود ہی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اماں پکارتی رہ گئیں۔ لیکن اُس نے اپنے کمرے کا

دروازہ بند کر لیا۔

اور لیٹا تو سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ اس لڑکی کا

کیا علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا

بالآخر اُس پر لعنت بھیج کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا

کہ بالکی سی دستک کی آواز پر چونک کر دروازے کی سمت

دیکھا۔ لیکن دستک دروازے پر نہیں تھی۔ وہ انتظار

کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی تو وہ

اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور جیسے ہی پردہ سمیٹ

کر کھڑکی کھولی، وہ کہنے لگی۔

”دیکھو تو کیسی چمکتی ہوئی دھوپ ہے اور تم

کمرے میں بند بیٹھے ہو۔“ چمکتی ہوئی دھوپ اُس نے

یوں کہا جیسے چاندنی چمکی ہوئی ہو۔ اور وہ دانت

پیس کر بولا۔

”یہ چمکتی ہوئی دھوپ تمہیں مبارک ہو۔ اب

اگر کھڑکی بجائی تو تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔“ اس کے

ساتھ ہی کھڑکی بند کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے درمیان

میں ہاتھ رکھ دیا۔

”ہاتھ بٹاؤ۔“ وہ خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے

دانت پیس کر بولا۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”نہیں بٹاتی، بے شک کھڑکی بند کر دو۔“ اُس

کی خود سری پر وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر

جیسے ہار مان کر بولا۔

"ان ساری باتوں سے آخر تمہارا مقصد کیا ہے۔" سب کا آنا جانا تھا۔ پھر بھی آبا کے مشورے کے بغیر
 کیا چاہتی ہو تم؟
 "تمہیں نہیں پتا؟" تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اور انہوں نے آپا سے
 "بجڑا نہیں۔" اس کے عاجزی سے کہنے پر وہ مگر آئیں گی اس کے بعد وہ آبا کو لکھ بھیجیں گی پھر جیسا
 چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی۔ انداز میں شکستگی مٹی اور وہ مناسب سمجھیں گے۔ وہ اس وقت بیٹی کے ساتھ
 اس نے بجائے اس کی خاموشی اور شکستگی محسوس کرتے۔ مہروف تھا۔ اسے چھوڑ کر پوری توجہ سے آپا اور اماں کی
 کے موقع غنیمت جان کر فوراً کھڑکی بند کر دی۔ اور اگر باتیں سننے لگا۔ پھر معافی خیال کے تحت آپا کو لوٹک
 لیٹ گیا۔ پھر شام میں آیا اور عرفان بھائی کی آواز کر بولا۔
 سن کر وہ کمرے سے نکل کر آیا تو اس وقت بھی
 دو اماں کے پاس موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر بہت خاموشی
 سے بچن میں چلی گئی، جس پر آپا، اماں سے پوچھنے
 لگیں۔
 "اماں! یہ لڑکی سارا وقت یہیں رہتی ہے
 کیا؟"
 "اکیلی ہے بیچاری، میں خود بلا لیتی ہوں! اماں
 اس کے ساتھ ہمدردی جتا کر بولیں۔
 "کیوں اماں! آبا کہاں ہیں اس کے؟"
 "استیصال میں ہیں۔"
 "اچھا ہاں! اس روز آپ نے بتایا تھا کچھ اچھے
 ہوئے اس کے آیا ابھی بھی ویسے ہیں؟"
 "بتا نہیں بتا! میں تو دیکھنے گئی نہیں۔ شاہجہاں
 جاتا ہے، اسے پتا ہوگا! اماں نے اسے دیکھتے ہوئے
 کہا تو وہ سرسری انداز میں بولا۔
 "ہاں ٹھیک ہو جائیں گے! پھر اس موضوع سے
 بٹنے کی خاطر روٹی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ اب کیا چائے
 وغیرہ کے لیے تمہیں کہنا پڑے گا؟"
 "چائے تلی بنا رہی ہے اور وغیرہ کے لیے آپ
 کو زحمت کرنی پڑے گی! روٹی اس سے کم نہیں تھی
 فوراً اسے کام سونپ دیا۔ تو وہ بیٹی کو لے کر نکل
 گیا۔
 پھر چائے کے بعد جب روٹی، تلی کے ساتھ مل
 کرات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تب آپا
 نے اماں کو اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ عرفان کی خالہ
 کئی دنوں سے روٹی کے لیے کہہ رہی تھیں۔ ان کا بیٹا
 مسام کویت میں ہوتا تھا اور اماں جانتی بھی تھیں،
 ظاہر ہے ایک عرصہ بتایا جی کے گھر رہی تھیں اور وہاں
 "ہاں! یہ بھی اچھا ہے کہ دونوں ایک ہی جگہ
 پر رہیں، میں لکھ دوں گی تمہارے آبا کو۔!"
 "آبا آئیں گے کب؟ میرا مطلب ہے سال کی
 چھٹی پر ان کا پروگرام ہے آنے کا؟" آپا نے پوچھا
 تو وہ کچھ حیران ہو کر بولا۔
 "ایک سال ہو گیا ہے آبا کو گئے ہوئے؟"
 "ہونے والا ہے اور انہوں نے چھٹی پر آنے
 کا کچھ لکھا تو نہیں! اماں نے ایک ساتھ دونوں کو
 جواب دیا تو قدرے توقف سے آیا کہنے لگیں۔
 "آجائیں تو اچھا ہے۔ روٹی کی شادی کر جائیں!"
 "اتنی جلدی! اماں نے چونک کر دیکھا۔
 "حسام کی امی کا ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے، کہہ
 رہی تھیں کہ دو مہینے بعد وہ چھٹی پر آئے گا تو اس
 بار اس کی شادی کر کے بھیجیں گی! آپا نے بتایا تو
 وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔
 "نہیں آیا! ہم اتنی جلدی روٹی کی شادی نہیں
 کریں گے، اماں اکیلی ہو جائیں گی!"
 "کیوں، تم نہیں ہو کیا، پھر تمہاری دلہن بھی
 آجائے گی!"
 "میری دلہن! وہ ہنسا۔ "میرا بھی دور دور تک

دلہن لانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔ دیکھیے گا اماں! امتیازوں سے فارغ ہوا نہیں کہ کہے گا میری دلہن لاؤ۔ اور مجھے تو دلہن یہیں کہیں نظر آرہی ہے۔“

آخری بات آپا نے معنی خیز شوخ مسکراہٹ کے ساتھ نظروں گھماتے ہوئے کہی تو ان کا اشارہ کچھ کروہ اُچھل پڑا۔

”خدا کو مانیں آپا! اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں۔“

”ارے تو وہ کون سا گئی گزری ہے۔ اتنی پیاری ہے اور دیکھو ابھی سے اس گھریں رچ بس گئی ہے۔“ آپا چھوڑتے ہوئے اُس سے اعتراف کروانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”بس رہنے دیں، اگر آپ مجھ سے کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لینا چاہ رہی ہیں تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔“ یہ عزم کیا کہہ رہے ہو؟“ اماں نا سمجھی کے عالم میں باری باری دونوں کو دیکھتے لگیں تو وہ کچھ سخت سے سر جھٹک کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

پھر یوں آنا فاناروہی کی بات کہی ہوئی اور شادی بھی سر نہ آگئی، جیسا کہ آپا نے بتایا تھا کہ دو مہینے بعد حسام بھی پیر آنے والا ہے۔ اور اُس کی امی کا ارادہ اس بار اُس کی شادی کر کے بھیجنے کا ہے۔ تو انہی کی بات سچ ہوئی، حالانکہ اماں ابھی روہی کی شادی کے حق میں نہیں تھیں۔ محض اس کی تعلیم کی وجہ سے چاہتی تھیں گزرتی ہوئی کرے۔ لیکن ادھر آپا نے حسام سے ملنے کے بعد لکھ کر بھیجا کہ لڑکا اچھا ہے۔ اگر وہ فوری شادی کے لیے کہہ رہے ہیں تو انکار نہیں کروں۔ پھر ظاہر ہے اماں کیوں انکار کریں، لیکن اتنے کم وقت میں اتنی تیاری کرنا۔ وہ سچ بچہ بوکھلا گئیں۔

پھر ایک تو آپا کے آنے سے انہیں کافی ہمارا مل گیا۔ دوسرے کتنے کام کی نے اپنے ذمے لے لیے۔ یوں اماں کی بوکھلاہٹ ختم ہوئی۔ اور چند دنوں میں سب تیاری بھی مکمل ہو گئی۔

آپا آنے سے قاصر تھے، جس کا روہی کو بہت افسوس تھا۔ لیکن پھر اس خیال سے خود کو بہلا لیتی کہ

وہ انہی کے پاس جاٹے گی۔ آپا نے بتایا تھا کہ حسام اُسے ساتھ ہی لے جاٹے گا۔ اور واقعی شادی کے ایک مہینے بعد حسام اُسے لے کر کویت چلا گیا، تو اُس وقت صحیح معنوں میں بتا چلا کہ وہ رخصت ہو گئی ہے۔ کیونکہ جب تک یہاں تھی۔ روزانہ آجاتی تھی۔ اگر بلی اماں کے پاس نہ ہوتی تب واقعی انہیں بہت زیادہ اکیلے پن کا احساس ہوتا۔ اب بہر حال بلی کا دم غنیمت تھا۔

دو ہر میں دو تین گھنٹے کے لیے وہ ہاسٹیل چلی جاتی اس کے علاوہ سارا وقت اماں کے پاس ہی رہنے لگی تھی۔ اور یہ فطری سی بات تھی کہ ہر وقت کے ساتھ نے اُسے اماں کے بہت قریب کر دیا تھا۔ اور اماں بھی اُس کے لیے نئے انداز سے سوچنے لگی تھیں۔ لیکن شاہجہان کے رویے سے کچھ خائف بھی تھیں۔ جانے وہ کیوں اس لڑکی سے خار کھاتا تھا۔

ایک دو بار اماں نے اشاروں کنایوں میں اپنا عندیہ ظاہر کیا جس پر وہ ہتھے سے ہی اُٹھ گیا۔ ”میں سرگز اسی بدتمیز لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔“

کبھی سوچے گا بھی نہیں؟“ اور اماں اُسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ ذکر نہیں چھیڑا۔ یوں بھی ابھی اس کی شادی میں دیر تھی، جب تک وہ اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو جاتا اماں اُس کی شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ اور گو کہ اُسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ لیکن اُس کا ارادہ الفت آری ایسے کرنے کے لیے باہر جانے کا تھا۔ اور اس بارے میں اُس نے ابھی اماں کو تو کچھ نہیں بتایا تھا۔ البتہ آپا کو اپنی خواہش لکھ بھیجی تھی اور ان دنوں وہ شدت سے اُن کے جواب کا منتظر تھا کہ بتا نہیں آپا کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اماں کو اکیلا چھوڑ کر تو نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ آپا یہاں آجائے۔ اور اُس نے انہیں یہی لکھا تھا کہ اگر وہ چارچھ مہینے میں واپس آجائیں تو وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپلائی کر سکتا ہے۔ اور اس روز آپا کا خط آیا تو اُس نے بہت بے صبری سے کھولا۔

انہوں نے لکھا تھا کہ وہ ضرور آکسفورڈ میں اپلائی کر دے، خود ان کی خواہش بھی یہی ہے۔ بس میں اپلائی کرنا چاہتا ہوں، ایڈمیشن کے لیے، تو اس اتنا پڑھتے ہی وہ چلاتا ہوا اماں کے پاس آیا۔

اماں! اتنا اجازت دے دی ہے؟

کس بات کی؟ تعجب سے پوچھتے ہوئے اماں نے لندن جاؤں؟

کی نظر اس کے ہاتھ میں کھلے خط پر پڑی تو اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

تمہارے آبا کا خط ہے۔ روٹی کیسی ہے وہاں؟

خوش تو ہے ناں؟

ایک منٹ! اماں کے سوالوں کا جواب دینے کے بعد کہنے لگیں۔

کے لیے اس نے کھڑے کھڑے پورے خط پر نظر ڈالی۔

بھراؤن کے پاس بیٹھے ہوئے بولا: "روٹی ٹھیک ہے"

خوش ہے؟

اور تم کس بات پر خوش ہو رہے تھے؟ اس نے پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر تعجب سے بولا۔

ہائیں! تم بھی یہاں موجود ہو؟

میں تو ہر دم ہر جگہ موجود ہوتی ہوں، بس تمہیں نظر نہیں آتی؟ وہ اس کی ایسی ہی باتوں سے جڑتا تھا۔

کہ اماں کا خیال بھی نہیں کرتی تھی اور جو منہ میں اٹکا ہوا دیتی تھی۔

اللہ کا کرم ہے مجھ پر کہ مجھے بری چیزیں نظر نہیں آتیں، اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تو اماں جو اسے ڈانٹنے جا رہی تھیں اس کے منہ پر خاموش ہو گئیں۔ اور قدرے توقف سے یاد آنے پر پوچھنے لگیں۔

ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے، کس بات کی اجازت دی ہے تمہارے آبا نے؟

پھر بتاؤں گا؟ وہ کہہ کر اٹھنے لگا کہ وہ بول پڑی۔

شادی کی اجازت مانگی ہوگی اس نے میرے سامنے بتاتے ہوئے شہر مارا ہے؟

میں شاہجہان! اماں بھی کتنی سیدھی تھیں۔

فوراً اس کا یقین کر کے تصدیق چاہی تو وہ سر پیٹ کر بولا۔

اماں! آپ بھی کس پاگل کی باتوں میں آتی ہیں؟

پھر غصے سے سنانے کی خاطر اماں کو بتانے بیٹھ گیا۔

سنو! تم کہیں نہیں جاؤ گے، میرا مطلب ہے آکسفورڈ، لندن وغیرہ کہیں نہیں؟ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔ تو وہ زور دے کر کہنے لگی۔

گیا۔ پھر جب منہ ہاتھ دھو کر کھانے کی غرض سے دوبارہ اس طرف آیا تو وہ موجود نہیں تھی، جس پر اس نے شکر کیا اور خود ہی کھانا نکال کر اندر اماں کے پاس لے آیا۔

اس کامیڈیکل میں آخری سال تھا۔ اور اب امتحانوں میں زیادہ وقت بھی نہیں تھا اس لیے ان دنوں اس کی ساری توجہ پڑھائی کی طرف تھی۔ کالج سے آنے کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے سو جاتا تا کہ رات میں دیر تک بڑھ سکے۔

اس وقت رات نصف سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی، ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ اس کی آنکھوں میں تنید اترنے لگی، تب اس نے کتاب بند کر دی اور اٹھنے سے پہلے ذرا دیر کو کمری کی بیک پر سر رکھ کر گریبا اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو پرسکون کر رہا تھا کہ کھڑکی کے قریب بہت ہلکی سی آہٹ نے خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ آواز ایسی تھی جیسے ہوا سے خشک پتیا گرا ہو اور وہ بھی یہی سمجھا انگڑائی لے کر اٹھنے لگا تھا کہ اس کی گنگناہٹ پر ٹھٹھک گیا۔ بہت دھیمی آواز میں گنگنا رہی تھی۔ سب جگ سوئے ہم جاگیں تاروں سے کریں باتیں!

چاندنی راتیں! وہ اس لڑکی کو سرا سر پاگل قرار دیتا ہوا بہت احتیاط سے کہ کوئی آہٹ نہ ہو، اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور اسی احتیاط سے ذرا سا پردہ سرکا کر دیکھا۔ کھڑکی بند تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنی جگہ پر آکر لیٹ گیا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی پتھر دل لے جس انسان تھا۔ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا لیکن وہ کیا کرتا کہ اس لڑکی کے لیے اس کے اندر کبھی کوئی لطیف احساس نہیں جاگا۔

حالانکہ وہ دیکھنے میں بڑی بھولی بھالی معصوم سی لگتی تھی، نہ تصنع نہ بناوٹ نہ خواہ مخواہ کا جھکنا شرمانا کچھ صاف گویا اس کے باوجود وہ کبھی بے اختیار اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ جانے کیوں؟ حالانکہ اس وقت سارے ماحول پر ایک سحر

”سمجھ رہے ہوتاں، اب کہیں جانے کی بات مت کرنا!“

”دماغ صحیح ہے تمہارا، تم کون ہو میرے معاملے میں دخل دینے والی، میں کہیں جاؤں، آؤں، تم سے مطلب!“ وہ پیشانی پر ہل ڈال کر ناگواری سے بولا۔ ”میں کون ہوں؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی، ”تمہیں اب تک نہیں بتا چلا کہ میں کون ہوں، اور تمہارے معاملے میں کیوں دخل دیتی ہوں؟“ ”کیوں؟ کیوں دخل دیتی ہو؟“ وہ صرخہ مچا کر بولا۔ ”اپنے آپ سے پوچھو!“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی تو وہ نچوٹ سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

پھر کتنے دن گزر گئے، تب کی کے البو جی ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے، کچھ بہتر علاج کے باعث اتنا ہوا تھا کہ وہ چھڑی کے سہارے تھوڑا بہت چلنے لگے تھے، اور اس کے لیے بلی کی امی اس کی بہت مشکور تھیں، ساتھ ہی اماں کی بھی جنہوں نے ان کی بیٹی کا خیال رکھا۔

لیکن اماں کا کہنا تھا کہ بلی ہمارا خیال رکھتی ہے اور ردی کے جانے کے بعد تو اس نے بالکل بھی اس کی کئی محسوس نہیں ہونے دی، بہر حال اب کس نے کس کا خیال رکھا۔ اس سے قطع نظر وہ خوش تھا کہ اب ہر وقت وہ سر پر مسلط نہیں رہے گی۔ لیکن اس وقت اس کی خوشی رخصت ہو گئی۔ جب کالج سے لوٹا تو وہ کچن کے دروازے سے جھانک کر پوچھنے لگی۔

”کھانا نکالوں؟“ وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر بلیٹ کر اس کے پاس آیا اور رसान سے بولا۔

”سنو، تمہارے ماں باپ کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ اور براہ مہربانی ہماری فکر چھوڑ کر ان کی خدمت کرو۔“

”ان کی خدمت سے میں کبھی غافل نہیں ہوں۔ سمجھے تم؟“ وہ اس کے جواب پر کندھے اچکا کر اندر چلا

طاری تھا۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اُلٹا اُسے تو وہ سچ مچ کان پکڑ کر باپ دادا کی تویہ کر چکا تھا کہ گایاں دیتا ہوا سو گیا تھا۔ اور اگلے روز شام میں اُس آئندہ اس لڑکی کے معاملے میں کچھ نہیں ہوئے گا۔ کے ابو کی خیریت معلوم کرنے کے بہانے اوپر چلا گیا۔ اس لیے اماں کی زبانی سن کر وہ لبس اس قدر بولا اور ادھر ادھر کی باتوں کے دوران بڑے خلوص سے تھا۔

اُنہیں مشورہ دیا کہ انہیں تلی کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اتفاق سے اُسی وقت وہ چائے کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر فوراً ترخ کر بولی۔

”تمہیں کیا فکر ہے، میں تم پر تو بوجھ نہیں ہوں۔“ جب چپ اُس کے کمرے میں چلی آئی، وہ اُس وقت اور وہ اسی بات سے چڑھتا تھا کہ وہ مصلحتاً بھی خاموش نہیں رہتی تھی۔ اپنے ابو کا خیال نہیں کیا اُنہی کے سے پوچھنے لگا۔

سامنے بول پڑی جس پر وہ بُری طرح شٹا گیا۔ تب اُس کے ابو سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں اُس سے بولے۔

”بوجھ تو تم کسی پر نہیں ہو بیٹی! اور شاہجہان تو بہت نیک نیتی سے مجھے میرا فرض یاد دل رہا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ طنز یہ ہنسی کے ساتھ اُسے دیکھ کر بولی، ”تمہیں اپنے فرائض یاد ہیں۔؟“

”اچھا انکل! میں چلتا ہوں۔“ وہ اُس کی بات نظر انداز کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو وہ چائے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”یہ کون پے گا؟“

”تم! وہ خشمگین نظروں سے اُسے گھورتا ہوا بہت تیز قدموں سے وہاں سے چلا آیا اور اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کے پیچھے ضرور آئے گی، اس لیے گھر میں بھی نہیں رکا۔ اماں سے کسی کام کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اماں کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ بلی کی امی اُس کی شادی کے سلسلے میں خاصی پریشان ہیں اور پریشانی کی وجہ اُن کی اپنی بیٹی تھی۔ جو شادی کے لیے ہامی نہیں بھر رہی تھی

جبکہ اچھے رشتے موجود تھے۔ اور اُس کا ظاہر ہے اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ ہی اُسے کوئی غرض تھی جیسی اُسے سبب جاننے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں

تھی کہ وہ اچھے بھلے رشتے کو کیوں انکار کر رہی ہے۔ پھر اُس روز جس طرح اُس نے اپنے ابو کے سامنے لوٹ دیا تھا کہ میں تم پر تو بوجھ نہیں ہوں، اُس سے

”ہاں کہو، کیا بات ہے؟“ اور وہ بغیر کسی متہید کے شروع ہو گئی۔

”میرے امی، ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اعتراض شادی پر نہیں بلکہ اُس رشتے پر ہے جہاں وہ میری نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔ شادی تو میں تم سے کروں گی۔“

”میرے امی، ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اعتراض شادی پر نہیں بلکہ اُس رشتے پر ہے جہاں وہ میری نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔ شادی تو میں تم سے کروں گی۔“

”میرے امی، ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اعتراض شادی پر نہیں بلکہ اُس رشتے پر ہے جہاں وہ میری نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔ شادی تو میں تم سے کروں گی۔“

”میرے امی، ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اعتراض شادی پر نہیں بلکہ اُس رشتے پر ہے جہاں وہ میری نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔ شادی تو میں تم سے کروں گی۔“

”میرے امی، ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے اعتراض شادی پر نہیں بلکہ اُس رشتے پر ہے جہاں وہ میری نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔ شادی تو میں تم سے کروں گی۔“

سے روک دیا۔ تو کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”بہت ظالم ہو تم شاہجہان! محبت خود تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور تم!“

اُس کا لہجہ بھگنے لگا تو وہ ایک دم خاموش ہو کر اُس کے کمرے سے نکل گئی۔ اور اُس کے اندر ذرا ملال نہیں جا گا بلکہ اُس کے جاتے ہی فوراً اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا کہ کہیں وہ دوبارہ نہ آجائے۔ اب اُسے یہ فکر تانے لگی کہ اس دیدہ دلیری کے بعد وہ لڑکی اب مسلسل اُسے تنگ کرے گی، اور ہو سکتا ہے اماں کے سامنے بھی ایسی کوئی بات کر جائے اُس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اور ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ جانے کیا کچھ سوچتا رہا پھر بھی اُسے لگا جیسے وہ اسے عاجز کر کے چھوڑے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شام میں وہ اماں کے ساتھ ہمیشہ کی طرح نظر آئی، مہنتی کھلکھلاتی، اور اُسے دیکھ کر روزانہ کی طرح اُس کے لیے چائے بنا لائی۔

اُس کے کسی انداز سے بھی دوپہر کی باتوں کا شبابہ ظاہر نہیں ہوا، جس پر اُسے قدرے حیرت ہوئی لیکن اسے اطمینان نہیں ہوا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل پھر اس کے پاس چلی آئے گی۔ اور اس خیال کے تحت وہ بہت محتاط ہو گیا کہ اب اُسے ایسا کوئی موقع نہیں دے گا۔

لگے دن سے اُس نے اپنا دوپہر کا سونا اماں کے کمرے میں کر لیا۔ کھانا کھاتے ہی وہیں سو جاتا۔ شام میں اُٹھتا تو کہیں ادھر ادھر نکل جاتا۔ اور جب رات میں پڑھنے بیٹھتا تو اپنے کمرے کو ہر طرف سے بند کر لیتا۔ چنانچہ اتنی احتیاط وہ کیوں کر رہا تھا۔ جبکہ وہ لڑکی اُس روز کے بعد سے اماں کے پاس تو معمول کے مطابق آتی تھی، لیکن اُس کے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔ بہر حال اپنی طرف سے وہ محتاط تھا اور امتحانوں تک اُس کی یہی روئین رہی۔

پھر امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی اُس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس کے بعد

”کیا؟“ وہ یوں اچھلا جیسے پختونے ڈنک مارا ہو، اور ایسی خوشخوار نظروں سے گھورتے لگا جیسے بھی کچا چبایا جائے گا۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بڑے آرام سے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں میری بات ابھی نہیں لگی۔“

”جب جانتی ہو تو خاموش ہو جاؤ اور اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہنا، اُس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔“

”کیوں؟ کیوں خاموش ہو جاؤں؟“ وہ چٹخ کر دے لہجے میں چینی، ”تمہاری طرح بزدل نہیں ہوں میں کہ خود اپنے آپ سے اعتراف کرتے کرتے ہمارے میں تو ساری دنیا کے سامنے چھج کر کہہ سکتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں!“

”شٹ اپ!“ اُس کا ضبط جواب دینے لگا۔ پھر بھی اُس نے منٹھیاں بھینچ کر خود پر قابو پایا۔ کیونکہ اُسے اماں کا خیال تھا جو برابر کے کمرے میں سو رہی تھیں، جبکہ وہ لڑکی کسی کا خیال نہیں کرتی تھی۔

”مت میرے ضبط کو آزماؤ بلی اور تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً یہاں سے چلی جاؤ!“

”ایسے نہیں جاؤں گی، پہلے تمہیں اعتراف کرنا ہو گا۔“ وہ غالباً آریا پار سوچ کر آئی تھی۔ تبھی اُس کے غصے کی پرواہ کیے بغیر آرام سے بولی تو وہ کچھ دیر تک آنکھوں کی پتلیاں سکپٹر کر اُسے دیکھتا رہا پھر زہر خند سے بولا۔

”اعتراف سنا چاہتی ہو تو سنو، نفرت کرتا ہوں میں تم سے، تم جیسی بدتمیز و بد لحاظ لڑکی کا میرے دل میں کہیں دور دور بھی گزر نہیں ہو سکتا!“ وہ ایک دم سناٹے میں آکر اُسے دیکھے گئی۔

”سن لیا تم نے، اب تم جاسکتی ہو!“

”کہاں جاؤں؟“ انتہائی دکھ میں گھری وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی، پھر ایک دم چونک کر اُسے دیکھ کر بولی۔

”سنو! میں خود کو تمہاری مرضی کے مطابق ڈھال سکتی ہوں، جیسا تم کہو گے میں!“

”پلیز!“ اُس نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید بولنے

یہاں تو فی الحال وہ بالکل نارخ ہی تھا۔ اور ایسی فرغت
 اسے بہت عرصے بعد ملی تھی جو کہ بہت طویل بھی نہیں
 تھی۔ آکسفورڈ میں انڈیشن ہو جانے کی صورت میں اسے
 پھر سے معروف ہو جاتا تھا دوسری صورت میں ہاؤس
 میں تو منع کرتی ہوں بیٹیا، یہ ماننی نہیں۔ اچھا تم

”بہت خوش ہو میرے جانے سے؟“
 اس لیے ان دنوں وہ سرگرم کی یا بندی سے آزاد
 ہو کر کچھ وقت اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح
 میں گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن ادھر بلی کی شادی طے ہو
 گئی۔ گو کہ یہ اس کے گھر کا معاملہ نہیں تھا۔ لیکن جس
 طرح رونی کی شادی میں اس نے امان کو اکیلے پن کا
 احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس طرح اماں نے خاص
 طور سے اسے ہدایت کی کہ بلی کے آنا کو بیٹے کی کمی کا
 احساس نہیں ہونا چاہیے، پھر وہ بیچارے معذور بھی
 تھے، بس گھر کے اندر ہی محوڑا بہت چل لیتے تھے۔
 یوں باہر کے سارے کام اس کے سر آں پڑے۔

”اچھا۔“ وہ ذرا سا ہنسی، اور اس سے پہلے کہ
 ”جہاں سے بھی ملاقات ہوئی، اچھا لڑکا ہے۔“
 ”تم سے اچھا!“ اُس کی کدھی بے باکی اسے
 سخت گراں گزرتی تھی، اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ تو
 درے توقف سے وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔
 ”مجھے تو اس اچھے پر ترس آ رہا ہے۔ بیچارہ ساری
 زندگی جھوٹی محنت کا فریب کھاتا رہے گا۔“
 ”مت ایسی باتیں کرو!“ اسے گہرا ہٹ ہوتے

”کیوں ڈرتے ہو؟“ وہ کھلکھلا کر ہنسی پھر براہ راست
 اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ”جی دار بنو شا، جہاں!
 مجھے دیکھو میں اپنے دو غلے پن کا اعتراف کر رہی ہوں۔
 ارے ہم سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، محبت کسی
 سے، شادی کسی سے۔“
 ”کیوں اپنی صف کو بدنام کر رہی ہو؟ وہ تاسف
 سے بولا۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔ اور یہ سچ میں اُس اچھے کے
 سامنے بھی بول سکتی ہوں۔“
 ”خدا کے لیے بلی! خاموش ہو جاؤ۔ اپنا نہیں تو
 اپنے ماں باپ کا خیال کرو۔“ وہ اُس کے سامنے آہٹ
 جوڑ کر بولا تو اب کے اُس کی ہنسی میں تلخی سمٹ آئی۔
 ”ماں باپ کا خیال ہی تو ہوتا ہے۔ جو ہم لڑکیاں
 ساری زندگی گئے لیے ”جھوٹی“ بن جاتی ہیں۔“ پھر ہاتھوں
 کے پالے میں چہرہ دکھا کر بولی: ”کتنی عجیب بات ہے
 نئی زندگی کی بنیاد میں پہلی اینٹ ہی جھوٹ کی رکھی
 جاتی ہے پھر بھی اُس پر پوری عمارت تعمیر ہو جاتی ہے۔“

گزشتہ دو سالوں سے وہ سامنے تھی، بلکہ خود اس کا کہنا تھا کہ میں تو ہر دم ہر جگہ موجود ہوتی ہوں، تمہیں نظر نہیں آتی۔ اور آج وقت نے اس مقام پر اسے گرفت میں لیا تھا کہ وہ حیران کھڑا تھا۔

یہ سانحہ چند روز پہلے بھی تو ہو سکتا تھا یا اب بھی نہ ہوتا۔ تو وہ اسے رخصت کر کے اطمینان سے سو جاتا۔ لیکن کیا ستم ظریفی تھی کہ وہ جو ہر دم ہر جگہ موجود رہ کر اسے نظر نہیں آتی تھی، وہ نظروں سے اوجھل ہو کر اس کے لیے ہر جگہ اپنے وجود کا احساس چھوڑ گئی۔

اس کی رخصتی کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ کتنے دنوں سے بحتی ڈھولک بھی خاموش تھی۔ ساری چہل پہل اور رونق جیسے وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی، اماں اور اس کے امی ابو کو ابھی اسے رخصت کر کے خاموشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جبکہ وہ کل سے خاموشیوں کی زد میں تھا۔ زرد کپڑوں میں بلبوس سرسوں کا پھول بنی وہ کس قدر اچانک اس کے دل کو چھو گئی تھی، جہاں اس کے خلاف اول روز سے نفرت بھرا تھا۔ وہاں اب نہ مٹنے والی خلش تھی۔

انتہائی بوجھل دل و بوجھل قدموں کے ساتھ وہ اماں کو لے کر نیچے آیا تو برآمدے ہی میں رُک گیا۔ اور وحشت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اماں جلنے کیا کیا بولے جا رہی تھیں، پہلے بلی کی شادی ہو جانے پر اطمینان کا اظہار پھر افسوس کہ امی اچھی لڑکی ان کی بہو کیوں نہ بنی۔ وہ اگر ہامی بھر لیتا تو۔ اور وہ اس کی بازگشت میں کھو گیا۔

”بہت ظالم ہو تم شاہجہان، محبت خود تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور تم۔“ وہ بے اختیار اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور پورا دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آیا پھر پردے سمیٹ کر کھڑکی کھولی تو زرد چاندنی چھن چھن کرتی اندر چلی آئی، اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر اس نے زور سے سر کو جھٹکا دیا۔ پھر بیڈ پر گرتے ہوئے دکھ سے بڑبڑاتا تھا۔

”محبت میرے دروازے پر دستک دیتی ہی اور

ہے ناں حیرت کی بات؟“

”میرے خدا! وہ اسے بہت پراسرار لگنے لگی تھی، فوراً اٹھ کر نیچے چلا آیا۔ اس کے بعد جب بھی اوپر جانا ہوا وہ دروازے ہی میں کھڑے کھڑے لوٹ آیا۔ کیونکہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور مندی والے روز تو وہ نیچے ہی مصروف رہا۔ کیونکہ سارا انتظام گھوڑ تھا۔ وہ گیٹ کے باہر شامیہ نہ وغیرہ لگوانے میں لگا رہا۔ اس کے بعد کچھ دیر آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں آکر لیٹا تو جانے کیسے ایک دم سے نیند مہربان ہو گئی۔ شام اتر رہی تھی جب اماں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”اٹھ جاؤ شاہجہان! کھانے کا انتظام دیکھ لو ابھی مغرب کے بعد وہ لوگ مندی لے کر آجائیں گے۔“ وہ اماں کی بات سننے ہی اٹھ گیا۔ اور الماری سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔ نہا کر نکلا تو اماں موجود نہیں تھیں، وہ سمجھ گیا اوپر گئی ہوں گی تب اس نے خود ہی چائے بنا کر پی پھر کمرے لاک کر کے باہر آ گیا۔

اور ابھی کھانے کا جائزہ لے رہا تھا کہ کسی بچے نے آکر کہا کہ اسے انکل بلا رہے ہیں۔ وہ سب چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔ دروازے ہی میں بلی کی امی مل گئیں۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”بیٹا! اپنے انکل کو نیچے لے جاؤ۔ وہاں مردوں میں بیٹھیں گے۔“

”جی بہتر کہاں ہیں انکل؟“

”ادھر کمرے میں چلے جاؤ! انہوں نے کہا تو وہ کچھ مہانوں کی موجودگی کے باعث قدرے جھجکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ابو واش روم کی طرف جا رہے تھے، اسے دیکھ کر لوٹے۔

”ایک منٹ رکو بیٹا! میں ابھی آتا ہوں۔“

”جی!“ وہ سینے پر بازو سمیٹا ہوا جیسے ہی بیٹا درسیانی دروازے سے اس کی طرف بڑے کمرے کے آؤی

کوئے میں بیٹھیں اس لڑکی پر اس کی نظریں یوں جمیں کہ سنا بھول گئیں۔ پہلے قدرے ملجے کپڑوں میں وہ اتنی رنجیدہ اور اداس نظر آ رہی تھی،

میں:۔“

”جلدی آنا، میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی“

وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ تو اُس نے
داش روم کا رخ کیا۔ اور جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر
بالوں میں برش کرتا ہوا کمرے سے نکل کر اماں کے
پاس آیا تو وہ کہیں نظر نہیں آئی، البتہ اُس کی مہک
چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہ کچھ حیران ہو کر اماں سے
پوچھنے لگا۔

”اماں! ابھی بلی آئی تھی؟“

”ہاں۔!“ اماں کے مختصر جواب پر وہ جبر بڑھو
کر بولا۔

”جلی کیوں گئی؟“

”نواب اُس کا آنا جانا اپنی مرضی سے تو نہیں
ہوگا، اُس کے میاں نے بلایا چلی گئی۔“

اماں نے کہا تو وہ گہری سانس سینے کے اندر
دکھتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔ کبھی اُس کا آنا گراں گزرتا تھا
اور اب اُس کے جانے پر آرزوگی نے دل کا دامن
تھام لیا تھا۔

”چائے لاؤں تمہارے لیے یا کھانا کھاؤ گے؟“
اماں نے پوچھا تو وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے
دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے، ابھی تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔
میں نے منع کیا تھا بلی کو لیکن وہ کہاں باز آنے والی
ہے۔ جگا کے چھوڑا تمہیں؟“ اماں اُس کے کھوٹے کھوٹے
انداز پر بولیں تو وہ دُکھ سے مسکرایا اور کرسی کی میک
پر سر رکھتے ہوئے سوچا۔

”مجھے جگا کر خود چلی گئی۔“

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے، وہ مسلسل
خود کو سمجھانے میں لگا ہوا تھا کہ وہ لڑکی بس ایک پل کو
اُسے اچھی لگی تھی، ورنہ تو اُس میں ایسی کوئی بات
نہیں تھی لیکن اُس ایک پل کی گرفت اتنی مضبوط تھی
کہ وہ خود کو سمجھاتے سمجھاتے ہار گیا۔

لیکن کسی سے شکوہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بس اندر
ہی اندر ایک آن دیکھی آگ میں آپ ہی آپ جلتا
رہا۔ اماں اُس کی غیر معمولی خاموشی غسوس کرتی پھر
اُسے توڑنے کے لیے جانے کہاں کہاں کے قصے

اُس پر ایک ساتھ کئی موسم بیت گئے تھے، ایک
پل دل اُس کی محبت کے اعتراف میں دھڑکا تو دوسرا
پل نارسائی کا درد جگا گیا تھا۔ اور اس میں تصور سراسر
اُس کا اپنا تھا۔ وہ کیوں اتنا کٹھور ہو گیا تھا کہ نہ
چاندنی راتوں میں اُس کی مدھرا آواز پر کان دھرے
نہ پیتی درپہروں میں اُس کی آہیں سنانا دیں اول

روز سے جو اُسے بدتمیز و بد لحاظ سمجھا تو پھر اس سے
سٹ کر سوچ ہی نہیں سکا۔ اور وہ بدتمیز بھی یا بد لحاظ
جاتے جاتے بہت خوبصورتی سے اُس کے دل میں اپنی
محبت کا درد جگا گئی تھی کہ تمام رات وہ اُس کی آواز
میں گویا رہا تھا۔

سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں!

چاندنی راتیں!
صبح کے قریب جا کر کہیں اُس کی آنکھ لگی، اس
کے بعد سارا دن سوتا رہا۔ اماں نے بھی اُس کی تھکن
کا خیال کر کے نہیں اٹھایا بس دوپہر میں ایک بار اُسے
بلا کر کھانے کا پوچھا۔ لیکن وہ منع کر کے پھر سو گیا تھا۔
اس کے بعد شام ڈھلے جانے کس نے اُس کے منہ
پر بانی پھینکا کہ وہ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے بھگے
چہرے کو دونوں ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا کہ اُس
کی کھلکھلائی ہنسی پر چونک کر دیکھنے لگا۔ فیروز سی سارلی
میں بلبوس قدرے گہرا میک اپ کیے وہ ہمیشہ سے
بہت مختلف نظر آئی۔ اُس کے دیکھنے پر اپنے قصوص
انداز میں بولی۔

”اب تم کہو گے یہاں کیوں آئی ہو۔ بھی دروازہ
کھلا تھا چلی آئی۔“

”اکیلی آئی ہو؟“ وہ نظریں پُرا کر پوچھنے لگا۔
”نہیں، وہ اچھا“ بھی ساتھ ہے اور ابو کے
پاس بیٹھا ہے“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسی تو وہ اٹھتے ہوئے
بولی۔

”تم نے تو اُس کا نام ہی رکھ چھوڑا ہے“ اچھا“
اچھا نام ہے۔ خیر تم اماں کے پاس بیٹھو میں منہ ہاتھ
دھو کر آتا ہوں“

لے بیٹھیں۔ وہ بس ہوں ہاں کرتا پھر اکتا کر اٹھ جاتا۔ کہیں کسی بات میں دل نہیں لگتا تھا۔ اور اب اس گھر سے اُسے وحشت ہونے لگی تھی، جس کی خاموشی۔ فضاؤں میں کسی کسی دن وہ آکر پھیل چا دیتی۔ ذرا بھی تو نہیں بدلتی تھی۔ اُس کی کھلکھلائی ہنسی پر وہ حیران ہو کر سوچتا کہ محبت کا دعو کرنے والی، محبت میں بار کر اتنی خوش کیسے ہے اور اُس روز وہ اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”تم نے مجھ سے محبت کا دعو کیا تھا۔ ایمان داری سے بتاؤ، اس میں کتنی سچائی تھی؟“
”سو فی صد!“ وہ کہہ کر ہنس۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ تم نے میرے ساتھ ٹانگ کھیل کر محض مجھے فریب دینے کی کوشش کی تھی؟ وہ جانے اُس سے کیا اگلوں اچا تھا اور وہ بڑے آرام سے بولی۔

”چلو یو نہی سہی، لیکن تمہیں کیا فرق پڑا، تم کون سا میرے فریب میں آ گئے؟“
”اگر آجاتا تو؟“ اُس نے چبھتی ہوئی سوالیہ نظریں اُس کے چہرے پر جمادیں۔
”تو اس وقت میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی ہوتی؟“

”ابھی کیا ہو؟“
”ابھی بھی خوش نصیب ہوں، بھرا بھرا گھر، اچھا شوہر اور کیا چاہیے خوش رہتی ہوں؟“ وہ کسی طرح اُس پر غصہ نہیں ہونے تو لہجے میں طنز سمجھ کر بولا۔
”گویا جمال تمہاری جھوٹی محبت کے فریب میں آ گیا ہے؟“

”سب آجاتے ہیں“ اُس کے طنز پر بھی اُس کی لاپرواہی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ کچھ اٹھلا اور کچھ جتا کر بولی۔

”خصوصاً وہ لوگ جو سچی محبتوں پر دروازے بند کر لیتے ہیں ان کی قسمتوں میں پھر جھوٹی محبت کا فریب ہی لکھا ہوتا ہے۔ دیکھنا ایک دن تم بھی“
”بکواس بند کرو!“ وہ تلملا کر بے اختیار چیخا۔ ”میں آتنا نادان نہیں ہوں کہ محبت اور فریب میں تمیز نہ کر سکوں“

”اچھا!“ وہ ذرا سا ہنسی۔ پھر براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگی ”جب خود پر اتنا بھروسہ ہے تو خفا کس بات پر ہو رہے ہو؟“
”خفا نہیں تو۔“ وہ کچھ شیشیا پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔

”مجھے تم پر حیرت ہو رہی ہے۔ اتنی جلدی سب کیسے بھلا دیا تم نے، میں نے تو سنا تھا خصوصاً لڑکیاں اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھلا پاتیں۔“

”اتنا اُلجھ کیوں رہے ہو شاہجہان، یہ بتاؤ اس وقت تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتے ہو؟“ اُس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو وہ ہونٹ بھینچ کر اُس کی طرف سے رخ موڑ گیا۔ تب وہ اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”چہ چہ، بڑے خود غرض ہو، چاہتے ہو ابھی بھی میں تمہاری محبت کا دم بھرتی رہوں؟“

”تم۔“ وہ ایک دم اُس کی طرف پلٹ کر بولا۔ ”تم جلی جاؤ یہاں سے۔ اور آئندہ میرے سامنے نہ آنا۔“
”کیوں؟“ اُسے شروع ہی سے جرح کرنے کی عادت تھی اور اب وہ اُسے کیا بتانا کہ وہ کتنا نادان تھا۔ شخص صدیں اُس کی نفی کرتے ہوئے خود اپنے جذبوں سے آگاہ نہیں ہو سکا۔ اور آگاہی ملی بھی تو کیب، جب وہ دسترس سے دور ہو چکی تھی، وہ نہ وقت موڑنے پر قادر تھا۔ نہ اُسے اپنے دل میں اچانک بیدار ہونے والے جذبوں کو کچلنے پر اختیار عجیب بے بس کر دینے والا موڑ تھا۔

اُسے اس لڑکی سے خوف آنے لگا جسے وہ ہمیشہ دھتکارنا آیا تھا اور اب دل چاہ رہا تھا اُسے سارے زمانے سے چھین کر کہیں بہت دور لے جائے۔ اگر اُس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون نہ ہوتا تو وہ بڑے آرام سے اُسے ورغلانے کی کوشش کرتا۔ اور ماں باپ کی ناموس کا خیال ہی اُسے روکے ہوئے تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کی جواگ اُس کے اندر دھک رہی ہے اُس کی ہلکی سی آہنج بھی اُس تک پہنچے، اُس کے ساتھ ہی جیسا کہ ابھی اُس نے خود غرضی کا طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ تم چاہتے ہو میں ابھی بھی

تمہاری محبت کا دم بھرتی رہوں تو شاید وہ ایسا ہی لگا۔

چاہتا تھا۔ گو کہ اُس کے منہ سے اعتراف سننے کا متنی نہیں تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر خوشی کی جھلک اور اُس کی کھلکھلائی ہنسی اُسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

اُس کے برعکس شاید وہ اُسے یاس و حسرت کی تصویر بنے دیکھنا چاہتا تھا۔

بات یہ بات اُس کی آنکھوں میں تہی اترے۔ اُس کے ہونٹ ایک ذرا سی مسکراہٹ کو ترسے ہوئے لگیں۔

اُس کے چہرے پر زار سائیٹوں کا کرب پھیلا ہوا۔ اور وہ بات کرتے کرتے اچانک کہیں کھو جاتے۔ لیکن وہ تو یوں لگتی تھی جیسے اُس نے کچھ کھو یا جا کر کہنے لگا۔

یہ نہیں اور یہ ہیں اُسے شبہ ہوتا کہ وہ اُس سے دل لگی کرتی رہی ہے، تب وہ گزرے ایک ایک پل کو سوچنے بیٹھ جاتا۔ اور اُس کے جن حیلوں کی وہ نفی کرتا رہا تھا۔ وہ اب اس شدت سے محسوس ہوتے

کہ جہاں اپنے شے کی نفی ہوتی وہاں بچتا دے اُس تھام لیتے۔ اُس کے بعد وہ بہت کوشش کرتا کہ اس کہانی کو یہیں ختم کر دے لیکن اُسے ایک کھوج سی لگی تھی جو کسی پل اُسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔

اس روز وہ لفظ ہر سرسری انداز میں اُس کے سامنے اُس رات کا ذکر کرے بیٹھا جب وہ اُس کی کھڑکی کے قریب کھڑی چاندنی راتیں، گنگنا رہی تھی، وہ سن کر اپنے ازلی لا پرواہ سے انداز میں بولی۔

”مجھے پتا تھا، تم جاگ رہے ہو اور میری آواز بھی سن رہے ہو۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کہنے لگا۔

”لیکن میری کھڑکی تو بند تھی، پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں جاگ رہا تھا؟“

”بس۔“ اُس نے کندھے اچکاٹے تو اُس کے اختصار پر وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بول لولا۔

”اب جہاں کے سامنے بھی گنگنا رہی ہو؟“

”ارے اُسے تو میں سامنے بٹھا کر گاتی ہوں؟“ وہ غفلت سے انداز میں بولی تو وہ چونک کر بول چھنے

”کیا چاندنی راتیں؟“

”نہیں، آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کے اُس کے گنگنا نے پر وہ بے اختیار ہونے لگا۔“

”کیا واقعی؟“ پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔ ”میرا مطلب ہے کیا واقعی وہ تمہاری زندگی میں بہار بن کے آیا ہے؟“

”آیا ہے یا نہیں، وہ بہر حال بہت خوش ہوتا ہے۔“

”اچھا۔ پھر تو بڑا الو کا؟“

”خبردار! میرے میاں کو الو کا پٹھا نہیں کہتا۔“ وہ فوراً لوط کر بولی تو وہ اُس کے چہرے پر نظریں

”جیسے محبت اور فریب میں تمیز نہیں، اُسے اور لگی کرتی رہی ہے، تب وہ گزرے ایک ایک پل کو سوچنے بیٹھ جاتا۔ اور اُس کے جن حیلوں کی وہ نفی کرتا رہا تھا۔ وہ اب اس شدت سے محسوس ہوتے

کہ جہاں اپنے شے کی نفی ہوتی وہاں بچتا دے اُس تھام لیتے۔ اُس کے بعد وہ بہت کوشش کرتا کہ اس کہانی کو یہیں ختم کر دے لیکن اُسے ایک کھوج سی لگی تھی جو کسی پل اُسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔

اس روز وہ لفظ ہر سرسری انداز میں اُس کے سامنے اُس رات کا ذکر کرے بیٹھا جب وہ اُس کی کھڑکی کے قریب کھڑی چاندنی راتیں، گنگنا رہی تھی، وہ سن کر اپنے ازلی لا پرواہ سے انداز میں بولی۔

”مجھے پتا تھا، تم جاگ رہے ہو اور میری آواز بھی سن رہے ہو۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کہنے لگا۔

”لیکن میری کھڑکی تو بند تھی، پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں جاگ رہا تھا؟“

”بس۔“ اُس نے کندھے اچکاٹے تو اُس کے اختصار پر وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بول لولا۔

”اب جہاں کے سامنے بھی گنگنا رہی ہو؟“

”ارے اُسے تو میں سامنے بٹھا کر گاتی ہوں؟“ وہ غفلت سے انداز میں بولی تو وہ چونک کر بول چھنے

ساتھ ہی ذکر لے بیٹھیں تو آپا ان کی تائید کرتے ہوئے اس سے کہنے لگیں۔

”ہاں شاہ جہان! اماں ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ بس اب یہیں جا کر وادہ شادی بھی، اماں اکیلی ہوتی ہیں، دلہن آجائے گی تو۔“

”بس آپا! آپ بھی اماں کی زبان بولنے لگیں۔“ وہ لوگتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں کوئی لمبے عرصے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ دو تین سال کی بات ہے۔ یوں گزر جائیں گے۔“

”کوئی یوں نہیں گزرتے۔ اچھا اگر تمہارا جانا طے ہی ہے تو شادی کر کے جاؤ۔“

”کیا؟“ آپا کی نئی منطق پر وہ اچھل گیا۔ ”ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ شادی کے بعد چلے جانا۔ دلہن یہیں میرے پاس رہ جائے گی۔“ اماں نے کہا تو وہ سر تھام کر بولا۔

”بس آپ دونوں ایک دوسرے کی باتوں سے اتفاق کرتی رہیں۔ لیکن میں اتفاق نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب، ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا نہیں میں اور آپ شادی کی بات کر رہی ہیں نہیں کرنی تجھے شادی؟“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر بائیک لے کر باہر نکل آیا۔ خواہ مخواہ موڈ خراب ہو گیا تھا۔ حالانکہ اماں اور آپا نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی پھر پتا نہیں کیوں وہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔ یونہی بے مقصد سڑکوں پر بائیک دوڑاتا رہا۔ اور جب شام ڈھلنے لگی تو ساحل پر چلا آیا۔

نم ہوائ کے جھونکوں نے اس کے اعصاب پر بہت اچھا اثر ڈالا، کچھ دیر وہ گیلی ریت پر ٹہلتا رہا پھر دیوار پر بیٹھ کر لہروں کی سرکشی دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ذہن آپ ہی آپ اماں اور آپا کی باتوں کی طرف چلا گیا۔ اور اس وقت جب وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ وہ دونوں غلط نہیں کہہ رہی تھیں، اسے واقعی اماں کی خاطر باہر جانے کا خیال چھوڑ کر نہیں سیٹھ ہونا چاہیے، مگر زردیٹروں میں بلبوس وہ زرد چہرہ نگاہوں میں آن سما یا۔ اس کے

وہ اسے نہیں درحقیقت خود کو بہلا رہا تھا کہ وہ اسے ٹھکرا چکا ہے اور وہ جو ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی اس کی آخری بات پر ذرا سا سکرانی تو وہ اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں جانتا ہوں، تمہارے لیے اپنے دل سے میری محبت کو نکال پھینکنا آسان نہیں ہے۔ لیکن کوشش ضرور کرو۔“

”اچھا۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، جیسے اچانک اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو، پھر قصداً بے نیلہ سنی بن کر بولنے لگی۔

”کیا میں تمہیں خوش نظر نہیں آتی؟“ اور ساری گزرتی تو اس کے خوش نظر آنے میں تھی جس سے وہ اپنے آپ میں بُری طرح ہرٹ ہو رہا تھا اور یہ سراسر اس کی خود غرضی تھی یا آپ اپنے دل میں درد جاگا تھا تو اس کی بے نیازی کھل رہی تھی، نظریں نیچا کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جاتے جاتے بولی تھی۔

”میں بہت خوش ہوں شاہ جہان!“

اس کا زلٹ آ گیا۔ لیکن وہ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی، اور وہ مالوس تو نہیں تھا۔ بس تاخیر سے کچھ جھٹلایا ہوا تھا۔ کیونکہ مسلسل ذہنی انتشار سے نجات کا اسے یہی ایک راستہ نظر آ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے کہیں دور چلا جائے جہاں اس کی کھلکھلائی ہنسی سنانے دے نہ اس کے مکتے چہرے پر نظر پڑے۔ اور وہ جتنی جلدی کر رہا تھا جانے کیوں اتنی دیر ہو رہی تھی۔ اور اماں تو شاید چاہتی ہی نہیں تھیں کہ وہ باہر جائے۔ ان کے اپنے ارمان تھے۔

میٹروں سے فارغ ہو چکی تھیں، اور وہ ایک ہی بیٹا تھا۔ چاہتی تھیں اس کی شادی کر کے بھوکھ لے آئیں، جمعی جب سے اس کا زلٹ آیا تھا، مسلسل اس پر دباؤ ڈال رہی تھیں کہ وہ باہر جانے کا خیال چھوڑ کر نہیں باؤس جا کر رہے۔ لیکن وہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔ اس روز آپا آئیں تو اماں ان کے

بعد اس کے کتنے روپ تھے، وہ نظریں چراتے۔ اتری سُرُنی کو وہ ابھی کوئی نام نہیں دے پایا تھا کہ چراتے تھک گیا۔ اور واپسی میں پھر وہی اضطراب تھا۔ وہ آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔
 وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔
 "اماں! میں بہت تھک گیا ہوں!"
 "کہاں چلے گئے تھے۔ بلی کی امی تمہارا پوچھ رہی تھی۔" اماں نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگا۔
 "کیوں، کوئی کام تھا انہیں؟"
 "پتا نہیں، صبح جا کر معلوم کر لینا۔" وہ خاموش ہو رہا پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔
 "اماں! بلی اپنے گھر میں خوش ہے؟"
 "خوش ہی ہوگی۔" اماں کا انداز سرسری تھا۔ جس سے وہ مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔

اگلے روز وہ ابھی اوپر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بلی کی امی خود آگیش، عید نہیں کچھ ہی دن تھے اور انہیں بلی کو عیدی وغیرہ بھجوانی تھی، اس سے کہا تو وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ پتا نہیں اس کے سسرال جانا مناسب تھا یا نہیں۔ بہر حال جب اس کی امی کہہ رہی تھیں تو وہ منع بھی نہیں کر سکا۔ اور ان کے کہنے پر اسی وقت تیار ہو کر جو کچھ سامان انہوں نے دیا وہ لے کر اس کے سسرال پہنچ گیا۔ غالباً اس کا دیور تھا جس نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور خود اسے بلانے چلا گیا۔

وہ بیٹھا تو سرسری نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو نظریں دروازے پر ٹکادیں۔ اس کا خیال تھا وہ آندھی طوفان کی طرح نازل ہوگی۔ جیسے اس کے کمرے میں آتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس وہ سست روی اور کچھ سوچتے ہوئے انداز میں داخل ہوئی، اور اسے دیکھ کر جانے کیوں خائف سی ہو کر بس اسی قدر کہہ سکی۔

"تم۔!" وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکا کیونکہ اس کے حلیے میں الجھ گیا تھا۔ قدرے ہلکے کپڑے، چوٹی میں سے نکل کر باتوں کی لٹیں چہرے کے دونوں طرف گویا احتجاج کرتی لگ رہی تھیں، آنکھوں میں

اتری سُرُنی کو وہ ابھی کوئی نام نہیں دے پایا تھا کہ چراتے تھک گیا۔ اور واپسی میں پھر وہی اضطراب تھا۔ وہ آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔
 وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔
 "اماں! میں بہت تھک گیا ہوں!"
 "کہاں چلے گئے تھے۔ بلی کی امی تمہارا پوچھ رہی تھی۔" اماں نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگا۔
 "کیوں، کوئی کام تھا انہیں؟"
 "پتا نہیں، صبح جا کر معلوم کر لینا۔" وہ خاموش ہو رہا پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔
 "اماں! بلی اپنے گھر میں خوش ہے؟"
 "خوش ہی ہوگی۔" اماں کا انداز سرسری تھا۔ جس سے وہ مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔

اگلے روز وہ ابھی اوپر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بلی کی امی خود آگیش، عید نہیں کچھ ہی دن تھے اور انہیں بلی کو عیدی وغیرہ بھجوانی تھی، اس سے کہا تو وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ پتا نہیں اس کے سسرال جانا مناسب تھا یا نہیں۔ بہر حال جب اس کی امی کہہ رہی تھیں تو وہ منع بھی نہیں کر سکا۔ اور ان کے کہنے پر اسی وقت تیار ہو کر جو کچھ سامان انہوں نے دیا وہ لے کر اس کے سسرال پہنچ گیا۔ غالباً اس کا دیور تھا جس نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور خود اسے بلانے چلا گیا۔

وہ بیٹھا تو سرسری نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو نظریں دروازے پر ٹکادیں۔ اس کا خیال تھا وہ آندھی طوفان کی طرح نازل ہوگی۔ جیسے اس کے کمرے میں آتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس وہ سست روی اور کچھ سوچتے ہوئے انداز میں داخل ہوئی، اور اسے دیکھ کر جانے کیوں خائف سی ہو کر بس اسی قدر کہہ سکی۔

"تم۔!" وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکا کیونکہ اس کے حلیے میں الجھ گیا تھا۔ قدرے ہلکے کپڑے، چوٹی میں سے نکل کر باتوں کی لٹیں چہرے کے دونوں طرف گویا احتجاج کرتی لگ رہی تھیں، آنکھوں میں

کرنے لگا۔ لیکن اگلے پل وہ سامنے آکھڑی ہوئی۔
 ”یہ صبح صبح تم کہاں جا رہے ہو؟“ اُس نے کچھ
 چونک کر اُسے پھر رکشے کو دیکھا اس کے بعد دوبارہ
 اس پر نظر میں جا کر بولا۔
 ”اور تم صبح صبح یہاں، کیا گھر والوں نے نکال دیا
 ہے؟“

تبس ایک پل کو اُس کا چہرہ تاریک ہوا پھر فوراً
 اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی۔
 ”ارے کس میں جرات ہے مجھے نکالنے کی میں
 خود آئی ہوں؟“
 ”کیوں، میرا مطلب ہے کل تو تم نے کہا تھا عید
 پر آؤں گی؟“

”عید میں دن ہی کتنے ہیں؟“
 ”اچھا سامنے سے سٹو، میں بہت ضروری کام سے
 جا رہا ہوں، اور سنو آہی گئی ہو تو ذرا اماں کو بھی دیکھ
 لینا۔“
 ”کیا ہوا اماں کو؟“ وہ سامنے سے ہنستے ہوئے
 پوچھنے لگی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی، میں نے دوا
 کھلا دی ہے پھر بھی ذرا دیکھ لینا۔ اوکے؟“
 اُس نے کہہ کر گھڑی دیکھی پھر فوراً بایک اشارت
 کر کے بھگائے گیا۔ تو وہ جو اُس کے سامنے جم
 کر گھڑی تھی، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی ٹانگیں کاٹ
 رہی تھیں۔

جب دوپہر ڈھل رہی تھی۔ تب وہ واپس آیا
 تو بہت خوش تھا اور اماں کے پاس اُسے بیٹھے دیکھ کر
 کچھ شرارت سے کہنے لگا۔

”ارے پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ صبح ملی نے راستہ
 کاٹا پھر بھی میرا کام ہو گیا؟“ وہ سمجھ گئی اُسے کہہ رہا ہے
 پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ تب اماں پوچھنے لگیں۔
 ”کیسا کام؟“

”بائے جانے کا،“ وہ بڑا مسرور سا اماں کے
 پاس بیٹھ کر بتانے لگا۔ ”برٹش ایمبسی میں پاسپورٹ
 جمع کرا آیا ہوں چند۔ روز میں ویزا لگ جائے
 گا۔“

”میں چلتا ہوں؟“ اور اُس نے مروٹا بھی نہیں روکا
 بڑے آرام سے بولی۔
 ”اچھا، سب کو میرا سلام کہتا۔ میں عید پر آؤں
 گی؟“
 ”میں کیا کروں؟“

وہ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اور گھر آکر وہ مسلسل
 اُس کے حلیے اور رویے کو سوچتا رہا۔ جتنی دیر اُس کے
 پاس بیٹھا ایک بار بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں
 کھلکھلا کر نہیں ہنسی تھی، جبکہ یہاں ہر طرف اُس کی ہنسی
 کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ اس سچ پر سوچتے ہوئے جانے
 کیوں اُسے اپنے دل پر نامعلوم سے بوجھ کا احساس
 ہوا۔ اور یہ عجیب بات تھی کہ اب تک تو وہ اس کی
 خوشی سے شاکھی تھا۔ بارہا دل چاہا اُس کے ہونٹوں
 کی ہنسی نوچ ڈالے، اور اُس کے چہرے پر مستقل
 حزن و ملال بکھر دے اور اب اُس کی دل گرنگی
 محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا خود
 اپنی کیفیات اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

رات دیر سے سونے کے باوجود صبح وہ جلدی
 اٹھ گیا۔ کیونکہ اُسے پاسپورٹ آفس کے علاوہ ایمبسی
 بھی جانا تھا۔ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو اماں خلاف
 معمول اس وقت کچن کے بجائے اپنے کمرے میں
 لیٹی تھیں۔ وہ دروازے سے جھانک کر پوچھنے لگا۔
 ”کیا ہوا اماں؟ آج ناشتا نہیں ملے گا؟“ جواب
 میں اماں نے اُسے اشارے سے پاس بلایا۔ پھر
 کہنے لگیں۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جوڑوں میں
 درد ہو رہا ہے۔ تم اپنے لیے ناشتا بنا لو اور مجھے
 ایک کپ چائے دے دینا۔“

وہ ان کی بات سن کر کچھ کہے بغیر کچن میں آگیا۔
 اور جلدی جلدی سلاٹس گرم کرنے کے ساتھ انڈیا
 فرائ کیا پھر چائے دم کر کے اندر لے کر آیا تو زبردستی
 اماں کو بٹھا کر انہیں ناشتا کرایا۔ اس کے بعد چائے
 کے ساتھ انہیں میبلٹ کھلائی پھر انہیں آرام کرنے
 کی تاکید کرتا ہوا بہت جلدت میں بایک لے کر جیسے
 ہی گیٹ سے نکلا ایک رکشہ اُس کے بالکل قریب
 آکر رکا۔ اُس نے توجہ نہیں دی اور بایک اشارت

”نہیں، میرا مطلب ہے ابھی یہیں رہوں گی،

بہت سارے دن۔ عید اور عید کے بعد بھی“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میرا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا، میں یہاں خوش رہتی ہوں“ وہ بڑے آرام سے اُس کی بات لوٹا کر چلی گئی اور وہ اُس کے پیچھے دیکھتا رہ گیا۔

پھر عید سے ایک روز پہلے ابا کی آمد سے اُسے ایک پریشانی سے نجات مل گئی، بلکہ مسئلہ حل ہو گیا۔ کیونکہ بچوں کے اسکول کی وجہ سے آیا، اماں کے پاس آکر رہنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھیں اور وہ اماں کو اکیلا چھوڑ کر جانے کے خیال سے خاصا پریشان تھا۔ بہر حال ابا کی آمد نے اس مسئلے کو حل کر دیا تھا۔ اور اس نے ابا کی اجازت سے عید کے تیسرے دن اپنی سیٹ اوکے کروالی۔ کیونکہ جب ہر صورت اس کا جاننا طے تھا تو پھر مزید یہاں رہنا محض وقت کا ضیاع تھا۔

عید کے دن گھر میں خاصی گہما گہمی رہی۔ ایک تو ابا کی آمد دوسرے اُس کے جانے کا سن کر کافی عزیز رشتے دار ملنے کے لیے آئے، سارا دن بس مہانداری میں ہی گزر گیا۔ رات میں اچانک اُسے خیال آیا کہ آج وہ سارا دن میں ایک بار بھی نظر نہیں آئی، پتا نہیں یہیں تھی یا اپنے گھر چلی گئی، پھر اپنی کوتاہی کا احساس ہوا کہ عید کا دن تھا، وہ صبح جا کر کم از کم ان کے ماں باپ کو سلام کر آتا۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ اُسی وقت بیڑھیاں چڑھ آیا۔ پتا نہیں وہ تھی یا نہیں بہر حال پہلے مرحلے پر اُسے نظر نہیں آئی۔ وہ سیدھا اُس کے ابو کے پاس چلا آیا۔ اور معذرت کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے صبح ہی آنا چاہیے تھا۔ لیکن مہانوں کی۔

آمد و رفت نے اس قدر مصروف رکھا کہ بہت چاہنے کے باوجود میں آ نہیں سکا“

”یہ کیا کم ہے کہ فارغ ہوتے ہی تمہیں ہمارا خیال آیا“ اُس کے ابو نے اُسے گلے لگا کر اُس کی ندامت کو کم کیا۔ پھر پاس بٹھا کر پوچھنے لگے، ”واقعی تم باہر جا رہے ہو؟“

”جہ جہ۔ اماں کو اکیلا چھوڑ کر جاؤ گے؟ اُس نے تاسف سے کہا تو وہ اُسے گھور کر بولا۔

”اکیلا کیوں؟ آیا آنے والے ہیں۔ اور اگر بالفرض محال ابا کی آمد سے پہلے میری روانگی ہوئی تو کچھ دنوں کے لیے آپا آکر اماں کے پاس رہ لیں گی۔ کیوں اماں؟“

”ہاں، اگر اُس کامیاں اجازت دے گا تب ناں؟ اماں کا انداز سوچتا ہوا تھا تب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اماں کے پاس آ بیٹھی اور ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”فکر نہیں کروں اماں! میں آپ کے پاس ہوں گی۔“

”خوش رہو بیٹی! تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”میرا گھر دور نہیں ہے“ وہ فوراً بول پڑی۔ تو وہ اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

”ولیسے بھی اس کا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا یہ یہاں خوش رہتی ہے۔“

”ایسی بات نہیں کرو! اماں نے اُسے لوک دیا تو وہ کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا پھر جلتے جلتے رکت کر پوچھنے لگا۔

”کھانا تو نہیں پکا ہو گا؟“

”کیوں نہیں پکا۔ بلی آگئی تھی اس نے پکا دیا۔ جاؤ نکال لو“

”میں نکالوں، نہیں جس نے پکایا ہے وہی نکال کر دے۔“

وہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور ابھی بیٹھا ہی تھا کہ وہ کھانا لے کر آگئی۔ اُس کے سامنے رکھی اور خاموشی سے جلنے لگی کہ وہ بے اختیار پکار بیٹھا

”سنو!“ وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی اور اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھنے لگا۔

”ابھی رہو گی یا شام میں چلی جاؤ گی؟“

”کہاں؟“ پتا نہیں اُس کا ذہن کہاں تھا جو اتنی آسان بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور وہ زور دے کر بولا۔

”اپنے گھر اور کہاں؟“

کہنیاں رکھ کر دور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بول، لو وہ گردن موڑ کر اس کے چہرے پر نظروں جاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”یونہی بے سبب؟“
”نہیں، اور تمہیں میں سبب نہیں بتاؤں گی!“
”تم نہ بتاؤ، میں جانتا ہوں!“ اس کے اتنے یقین سے کہنے پر وہ ذرا سا ہنسی۔

”اچھا کیا جانتے ہو؟“
”میرے جانے کے خیال سے رو رہی تھیں!“
”ہیں!“ وہ ایک دم اندھیرے سے نظروں ہٹا کر اُسے دیکھنے لگی، اور کچھ شریر ہنسی کے ساتھ بول، ”برائی خوش تھی ہے تمہیں، تمہارے جانے کا خیال تو مجھے اطمینان دیتا ہے۔ خوش ہوتی ہوں میں!“

”کیا واقعی؟“ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی اور لہجے میں ہلکا سا طنز سمٹ آیا۔ جسے محسوس کر کے وہ خاموش ہو رہی تو قدرے توقف سے وہ کہنے لگا۔
”سنو، سبب خواہ کوئی بھی ہو، تمہارے آنسو مجھے بہت بے چین رکھیں گے!“ وہ ایک دم چونک کر دیکھنے لگی تو اس کے چہرے سے نظروں ہٹا کر دور اندھیروں میں دیکھتا ہوا وہ اچانک کھودینے کے احساس کے ساتھ بے پناہ آزر دگیوں میں گھر کر کہنے لگا۔

”اب اس مقام پر اعتراف کوئی معنی نہیں رکھتا پھر بھی مجھے کہنے دو کہ تمہاری محبت جیت گئی، اور میں بار گیا۔ تمہیں کھونے کے بعد احساس ہوا کہ میں کس قدر بے خبر تھا اور کتنا اچھا ہوتا جو میں ہمیشہ بے خبر ہی رہتا۔ آگاہی نے تو میرا سکھ چھین سب چھین لیا۔ یقین کرو گی، تمہارے جانے کے بعد کسی رات کی سحر نہیں ہوئی اور شاید ہوگی بھی نہیں!“

وہ خاموش ہو کر اُسے دیکھنے لگا تو وہ جو سناٹے میں کھڑی تھی نظروں پچرا کر ذرا سا رخ موڑ گئی۔
”کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے پھر وہ اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔“

”سنو بکی! اگر تم جال کے ساتھ خوش نہیں ہو تو میری طرف لوٹ آؤ، میں تمہیں!“
”اُس نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ گڑ بڑا گیا پھر سنبھل کر کہنے لگا۔“

”جی، پرسوں روانگی ہے!“
”اچھا اچھا، اللہ تمہیں کامیاب کرے!“ انہوں نے اس کا کندھا تھک کر دعا دی، تبھی وہ چائے لے کر آگئی۔ بڑے میں چائے کے ساتھ کافی لوازمات تھے، غالباً عید کے باعث۔ وہ ٹبل کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور ایک ایک پلیٹ اُس کے سامنے رکھنے لگی تو اُسے ٹوکنا پڑا۔

”پلیٹر، یہ اتنا تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رہنے دو یہ سب، میں ابھی کھانا کھا کر آیا ہوں!“
وہ کچھ نہیں بولی، بڑے آرام سے یہ کام چھوڑ کر چائے بنانے میں لگ گئی، پھر کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”چائے بھی پیو گے یا نہیں؟“
”نہیں خیر، چائے تو ضرور پیوں گا!“
”اُس نے فوراً کپ اٹھا لیا، پھر اُسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ کیسے نظر انداز کر کے اٹھ کر چلی گئی۔ پتا نہیں کیوں ادھر جب سے وہ آئی تھی ایسے ہی کچھ۔ چپ چپ سی تھی۔ کئی بار اُس نے چھٹرا لٹکا بھی لیکن وہ انجان سی بن گئی اور یہ اس کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ اس کے رویے کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ابھی چائے پیتے ہوئے نظار اُس کے ابو سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن سارا دھیان اُنسی کی طرف تھا۔ چائے ختم کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے اجازت لے کر کمرے سے نکلا تو وہ دیوار کے پاس کھڑی نظر آئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس چلا آیا۔ اور قدرے فاصلے سے دیوار پر کہنیاں لٹکا کر اُسے دیکھا تو چونک گیا۔

پتا نہیں شاید رو رہی تھی۔ اور اُس کی آمد پر آنسو چھپانے کی خاطر جلدی سے نیچے جھک گئی۔ لیکن وہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چپکتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ سیدھی کھڑی ہوئی پوچھنے لگا۔
”رو رہی تھیں؟“

”ہاں!“ اُس نے صاف گوئی سے اعتراف کر لیا۔
”کیوں؟“
”بس دل چاہ رہا تھا!“ وہ اسی کی طرح دیوار پر

”جھوٹ اور فریب پر تعمیر کی گئی عمارت زیادہ اور اُس نے جھٹلایا تو نہیں البتہ بچے میں تائست
دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی“

”میں جانتی ہوں“ وہ ایک دم بول پڑی ”کیا ہو“

”ہاں، میں تمہاری وجہ سے یہاں آئی ہوں“

”گنا، زیادہ سے زیادہ یہی ناں کہ کسی دن یہ عمارت میرے سر پر آن کرے گی، پر وہ نہیں، لہٰذا ہی عمارت کے پلے تلے دب کر مر جانا اُس رسوائیوں کی دلدل سے بہت بہتر ہے جس کی طرف تم بھے بلا رہے ہو۔ چہچہہ“

”بلیز بلی! جذباتی ہونے کے بجائے سنجیدگی سے میری بات پر غور کرو! اتنی طویل زندگی محض بھوتے کی بنیاد پر گزارنا بہت دشوار ہوگا۔“

”نہیں کرو شاہجہان! مجھے پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور مت کرو۔ میں جمال کے ساتھ خوش ہوں“

”اوہ نہ خوش! دیکھا تھا میں نے اپنے ہی گھر میں اجنبی لگ رہی تھیں تم“ وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولا۔

”محض تمہارا وہم ہے“

”چلو وہ میرا وہم تھا۔ ابھی بتاؤ، آج عید کا دن تھا، خصوصاً تمہاری شادی کے بعد پہلی عید پھر تم اپنے گھر کی بجائے یہاں کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”وہ جیسے اُس سے سچ اگلو نے پرتل گیا اور وہ بے اختیار کہہ گئی۔“

”تمہاری وجہ سے“ پھر فوراً زبان دانتوں میں دبالی تو وہ جو بہت تیز چبھتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔

”کچھ رک کر بولا۔“

”تم تو بزدل نہیں تھیں۔ پھر یہ اعتراف کرنے میں دیر کیوں لگائی؟“

”کسسا اعتراف؟“ وہ قصداً انجان بن کر پوچھنے لگی، تو وہ گہری سانس کھینچ کر کچھ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔

”یہ یہی کہ تم میرے بنا نہیں رہ سکتیں!“

”تم غلط سمجھ رہے ہو، میرا یہ مطلب نہیں تھا“

”پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بڑی دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اُسے جھٹلا نہیں سکے گی،

”لندن سے الف آر سی ایس کرنا پہلے صرف اس کے پلے تلے دب کر مر جانا اُس رسوائیوں کی دلدل سے بہت بہتر ہے جس کی طرف تم بھے بلا رہے ہو۔ چہچہہ“

”بلیز بلی! جذباتی ہونے کے بجائے سنجیدگی سے میری بات پر غور کرو! اتنی طویل زندگی محض بھوتے کی بنیاد پر گزارنا بہت دشوار ہوگا۔“

پھر شام میں جب وہ اُس کے امی ابوسے مل کر نیچے آ رہا تھا۔ تب وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اتنا آیا، دوہا بھائی اور بچے اُس کے ساتھ ایسے پورٹ جانے کو تیار کھڑے تھے، البتہ اماں نہیں جا رہی تھیں، وہ کتنی دیر اماں کے سینے سے لگاؤ کی دُعا میں لیتا رہا، پھر اتنا کے ٹوکنے پر اُس پر ابوداؤدی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور ابھی تو سفر شروع ہوا تھا کہ وہ واپس کا سوچنے لگا۔ تین سال بعد جب وہ واپس آئے گا تو وہ اپنی مخصوص کھانسی کھاتی ہنسی کے ساتھ اچانک سامنے آن کھڑی ہوگی۔ پھر خوشی سے کہے گی۔

”کیا لگتی ہوں میں تمہاری جوتھ؟“

ایسے پرسش کی آواز پر وہ اپنے خیال سے چونک کر دیکھنے لگا۔ اُس نے کھانے کا پوچھا تو منع کر کے سدا ہوا بیٹھا۔ اور جیب سے سگریٹ کا سیٹ نکالا تو ایک سفید رنگ کا لفافہ بھی ساتھ آگیا۔ تجھ نا کبھی کے عالم میں اُس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی نام نہیں تھا البتہ لفافے کے اندر رکھے کاغذ پر کبھی تحریر بہت دھندلی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے سگریٹ کا پیکیٹ واپس جیب میں رکھ کر لفافے میں سے تہہ شدہ کاغذ نکال کر کھولا تو ذرا سا چونکا پھر تحریر پر نظروں دوڑاتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

شاہ جہاں!

حیران مت ہو، تم جانتے ہو پہل ہمیشہ میری طرف سے ہوتی ہے۔ محبت میں، اعتراف میں اور آج جب تم نے خط لکھتے کو کہا تو میں نے سوچا ہمیشہ کی طرح پہل میں کروں، تم جواب لکھنا، لیکن نہیں جواب تو شاید میں لکھ رہی ہوں، ان ساری باتوں کا جو تم نے کہیں۔ جو کہنا چاہتے تھے اور جو تمہیں بہت سس رکھتی تھیں، حالانکہ ہماری کہانی تو اسی روز ختم ہو گئی تھی جب میری محبت کے جواب میں تم نے اپنا دروازہ بند کر لیا تھا۔

اس کے بعد ایک ہی کہانی جانے کی بات

رہی تھی۔

اگلے روز آج صبح ہی سے آگیش تو اماں نے انہیں مختلف اقسام کے حلویے بنانے میں لگا دیا۔ اور وہ آئی تو آج کے ساتھ کچن میں مصروف ہو گئی۔ اُس وقت وہ اپنی ٹینگ میں لگا ہوا تھلا اُس کی آواز سنتے ہی سب تھوڑے کمرے سے نکل آیا۔ کچھ دیر برآمدے میں اماں کے پاس ڈک کر انہیں خشک میوہ چھانٹتے ہوئے دیکھا پھر کچن میں آکر پہلے آپا کو غائب کیا۔

”آپا! یہ آپ آتے ہی کتنی کاموں میں لگ گئیں؟ تمہارے لیے حلویہ جات تیار ہو رہے ہیں؟“

جوتھ کے پاس کھڑی آیا نے اُسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

”خوشبو تو ابھی آ رہی ہے پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگا: تم یوں کیوں کھڑی ہو، ایک کپ چائے ہی بنا دو۔“

اُس نے خاموشی سے کتیلی اٹھائی اور پانی ڈال کر دوسرے چولہے پر رکھ دی۔ تو وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آکر بیٹا پر کھلے سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے لے کر آئی تو اُس کے ہاتھ سے کپ کتے ہوئے وہ فوراً بولا۔

”سنو، تجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے“

”کیا بات؟“ اُس کا ہجیمہ کھڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ یکسر غور انداز کر گیا۔

”تم بیٹھو تو۔“

”نہیں۔ بس ایسے ہی ٹھیک ہے؟“ اُس نے کہا تو وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا پھر اپنے آپ اپنی میں سر ہلا کر بولا۔

”نہیں اس وقت تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ بات خراب ہو سکتی ہے، جبکہ میں بات بنا رہا ہوں اچھا دیکھو میں جانتے ہی تمہیں خط لکھوں گا؟“

”تجھے؟“ قدرے حیران ہو کر اُس نے اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”ہاں تمہیں، وہ ساری باتیں جو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں، خط میں لکھوں گا۔ اور تم پلیز میرا خط کھولنے سے پہلے اپنا موڈ ٹھیک کر لینا، وہ کچھ نہیں بولی اور اس خاموشی سے چلی گئی۔“

قرآن مجید کی حدیث آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی مسلمات میں اضافے اور تبلیغ کیلئے سٹلنگ کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے محفوظ رکھیں۔

Digitized by

کیسے شروع ہوئی، مجھے نہیں پتا۔ بہر حال میں خوش ہوں یا ناخوش تمہیں اس سے کوئی غرض تو نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن تم مسلسل میرے تغائب میں رہے اور آخر میں بس اتنا جان سکے کہ میں جمال کے ساتھ خوش نہیں ہوں اور تمہارے لیے اتنا جان لینا ہی کافی تھا۔ اس کے بعد تم نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ارے نادان! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ہم لڑکیاں ساری زندگی کے لیے جھوٹی بن جاتی ہیں۔ صرف اس لیے کہ ایک بار جس شخص کی سیج پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اُس سے من کا ناتا جڑے نہ جڑے۔ تن کا ناتا کبھی نہ ٹوٹے کہ اس ناتے کے سینکڑوں گواہ ہوتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے جواب دہی کا عذاب کم از کم ہم لڑکیاں نہیں بہہ سکتیں۔ بہر حال تم نے یہ جان لیا کہ میں خوش نہیں ہوں، سبب میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تم۔ ہاں تم ہو سبب۔

اول روز مجھے رخصت کرتے ہوئے جلنے جمال نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے یا تمہارا حد درجہ ٹھہلا ہونا اُسے شے میں مبتلا کر گیا کہ تم میرے لیے طعنے بن گئے۔ بات بے بات "وہ تمہارا نامراد عاشق" ادھر یہ باتیں، ادھر آتی تو تم مجھے کھینچنے میں لگ جاتے، اور میں تو "جھوٹی بن چکی تھی پھر تمہارے سامنے سچ کیسے بول دیتی۔ اور اب مجبوراً سچ بولنا پڑ رہا ہے، تمہیں تمہاری غلط فہمی دور کرنے کے لیے، میں تمہاری محبت میں سسرال چھوڑ کر نہیں آئی بلکہ مجھے تمہاری وجہ سے نکالا گیا ہے۔ عید سے چند روز پہلے وہ جو امی نے

تمہارے ہاتھ عیدی بھجوائی تھی، بس اس روز تمہارا آنا قیامت لے آیا۔ جمال نے یہ کہہ کر مجھے گھر سے نکال دیا کہ اُس کے گھر میں جوان بہنیں ہیں۔ میں بجائے اپنے نامراد عاشق کو یہاں بلانے کے خود اس کے پاس چلی جاؤں۔ اس میں تمہارا کوئی تصور نہیں۔ تمہیں امی نے بھیجا تھا اور امی کب جانتی تھیں۔ ابھی بھی نہیں جانتیں نہ میں بتاؤں گی کیونکہ مجھے یقین ہے۔ جمال اپنے کیے پر نادم ہو کر مجھے لینے ضرور آئے گا۔ ابھی نہیں تو کچھ وقت گزرنے کے بعد کیونکہ اُسے نیچے بہت پسند ہیں۔ اور اپنے نیچے کائنات کو تو وہ بھاگا چلا آئے گا۔ شکر ہے اس وقت تم یہاں نہیں ہو گے، ورنہ تمہاری آنکھوں میں اتر آئے والی مٹی ایک بار پھر میرے راستوں کو دھندلا سکتی تھی۔

اس سے آگے اُس کی آنکھوں کے سامنے لفظ دھندلا گئے تو اُس نے جلدی سے رومال نکال کر یوں آنکھیں صاف کیں جیسے اُس کے راستے میں جو تھوڑی سی دھند باتی تھی اُسے صاف کر رہا ہو، تبھی کہیں قریب اُس کی سرگوشی سنائی دی۔ "کیا لگتی ہوں میں تمہاری؟"

"کچھ نہیں" وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور سیٹ کی لپٹ پر سر رکھ کر اپنی اگلی منزل کے بارے میں سوچنے لگا۔

